بات چیت

(آل انڈیا ریڈیو کی تقریروں کا مجموعہ)

صالحہ عابد حسین

سنہ ۱۹۴۶ء

صالحہ عابد حسین صاحبہ نے اسٹیٹ پریس لیتھو میں چھپوا کر شایع کی

فہرست

دیباچہ

بات چیت میری ریڈیو کی تیرہ ۱۳ تقریروں کا مجموعہ ہے۔ یہ تقریریں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک دہلی ریڈیو اسٹیشن سے زیادہ تر عورتوں کے پروگرام میں اور بعض تعلیمی پروگرام میں وقتاً فوقتاً نشر ہوئی ہیں۔

تقریروں کی ترتیب میں اس کا خیال نہیں رکھا گیا کہ کونسی پہلے نشر ہوئی اور کونسی بعد میں بلکہ موضوع کا خیال رکھا گیا ہے۔ مثلاً "میں نے لکھنا کیسے شروع کیا" ۴۴ء میں نشر ہوئی تھی، وہ سب سے پہلے رکھی گئی ہے "میل جول" "ہمارا اخلاق" غالباً ۴۵ء میں نشر ہوئی ہیں اور "استانی جی" "تیمارداری" وغیرہ ۳۶ء ۳۷ء میں۔

تقریروں کے انتخاب میں اس بات کو مدنظر رکھا ہے کہ جو تقریریں بہت پسند کی گئیں یا میرے خیال میں عورتوں کے لئے زیادہ مفید تھیں صرف وہی اس مجموعہ میں شامل کی گئی ہیں۔ اکثر تقریریں مثلاً کتابوں پر ریویو، اصلاح زبان اور بعض دوسرے موضوع پر جو ہنگامی یا غیر دلچسپ تھے وہ میں نے اس میں شامل نہیں کی ہیں۔

میں جناب ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو کی شکر گذار ہوں کہ انھوں نے ان تقریروں کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی اجازت عنایت فرمائی۔

صالحہ عابد حسین

نینی تال۔ ۱۹ ر مئی ۱۹۴۶ء

عم محترم خواجہ غلام السبطین مرحوم کی یاد میں

چچا ابا! آپ کی محبت اور شفقت، تنبیہ اور نصیحت ہمدردی اور خدمت سخاوت اور رحم دلی، بے نفسی اور بے ریائی۔ صداقت اور صاف گوئی سادگی اور جفاکشی غرض آپ کی سیرت کی ایک ایک خوبی آپ کے بچوں کو یاد آ آکر تڑپاتی ہے۔ آپ کے دنیا سے سدھارنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ہم سے وہ انمول دولت چھن گئی جس کی تلافی دونوں جہاں کی نعمتیں بھی نہیں کر سکتیں آپ ہم سے جدا ہو گئے۔ مگر آپ کی پیاری یاد ہمارے لئے شمع راہ ہے۔ خدا ہمیں توفیق دے کہ آپ کی بلند سیرت کی مثال پیش نظر رکھیں اور آپ کے نقش قدم پر چلیں۔

آپ ان تقریروں کو سن کر خوش ہوتے اور شاباش دیتے تھے اس لئے یہ حقیر مجموعہ آپ کی نذر ہے۔

مقدّمہ

"بات چیت" محترمہ صالحہ عابد حسین کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مختلف اوقات میں دہلی ریڈیو سے نشر کیں۔ یہ باتیں تین قسم کی ہیں۔ "اپنی باتیں" "اپنوں کی باتیں" اور "اوروں کی باتیں"۔ ان میں عورت کے فرائض شادی کے بعد، تیمار داری، بد مزاج بیوی، جیسے گھریلو قسم کے عنوان بھی ہیں اور حالی کے اصلاحی ادب، خالدہ خانم، عورتیں اور آزادی، جیسے عام دلچسپی کے موضوع بھی کتاب کی خوبی، دل کشی اور دل آویزی کے کئی وجوہ ہیں۔

صالحہ عابد حسین ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں جو اپنے علمی و ادبی ذوق اپنی تہذیبی صفات اور سماجی خدمات کی وجہ سے مشہور رہا ہے۔ وہ حالی کے خاندان سے ہیں، اور بقول ڈاکٹر ذاکر حسین کے "ہماری تاریخ سیاسی میں، تاریخ تعلیمی میں، تاریخ معاشرت میں، تاریخ ادب میں، جہاں کہیں پچھلی نصف صدی میں کسی صحیح حرکت کی روانی دکھا دے تو اس کا سلسلہ اس ادیب، شاعر، مصلح، محبِ وطن اور سب سے زیادہ اس صاف دل اور فرشتہ خصائل انسان کی کاوش کے چشمۂ صافی سے جا ملتا ہے۔" انھیں ایک پاکیزہ ادبی ذوق۔ ایک سنجیدہ اور مہذب باشعور، ایک علمی رجحان زندگی کو ایک اچھے نصب العین کی آنچ سے گرم اور روشن بنانے کا ولولہ اپنے گھر کے ماحول سے بہتر آیا۔ ان کے بھائی خواجہ غلام السیدین اور ان کے شوہر ڈاکٹر حامد حسین ہندوستان کی علمی و ادبی زندگی میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا

تعلق جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بہت گہرا ہے، اور جامعہ سے تعلق ایک روح پرور فضا کا ضامن ہے۔ مگر ادب میں بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی میراث اور ماحول سب کچھ نہیں ہے جس طرح کہ تمدن ورثے میں ملتا ہے مگر تہذیب ہر شخص کو حاصل کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح ادبی ذوق ورثے اور ماحول سے مل سکتا ہے۔ مگر ادیب خود بنتا ہے۔ صالحہ عابد حسین نے ان چیزوں کو اپنے طور پر حاصل کیا ہے اور اب اسے دوسروں تک پہنچانے اور پھیلانے کے برگزیدہ کام میں مصروف ہیں۔

کرشن چندر نے عصمت چغتائی کے ایک مجموعے پر دیباچے میں صفِ اوّل کا مذاق اڑایا ہے اور لکھا ہے کہ آج کل ادیبوں سے لے کر فاسفورس کے تیل تک سب صفِ اوّل کی چیزیں قرار دی جاتی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ صالحہ عابد حسین خواتین ادیبوں کی صفِ اوّل میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ ان کا درجہ متعین کرنے میں چنداں مفید نہ ہوگا۔ بلکہ ان کے مضامین کا جائزہ اور ان کی خصوصیات کا تذکرہ غالباً زیادہ اہم سمجھا جائے۔

ان مضامین میں مجھے پہلا مضمون "میں نے لکھنا کیسے سیکھا" بہت پسند آیا کتنے ہی لکھنے والے، ادب کو محض ایک فن سمجھتے ہیں یا محض ایک آڑ یا سہارا۔ کچھ کے نزدیک یہ سو فی صدی پسینہ ہے اور کچھ اسے محض ایک شیریں دیوانگی سمجھتے ہیں اور اس دیوانگی کو مقدس مانتے ہیں۔ اس میں بیان واقعہ ضروری نہیں حسنِ بیان ضروری ہے۔ لیکن اس میں جان واقعیت اور حقیقت سے آتی ہے محض کتابوں کے نام لے دینے سے یا مرعوب کُن الفاظ سے نہیں آتی۔ کچھ لوگوں کے ادب میں بقول ایک نقاد کے کتابوں کی بو آتی ہے۔ حالانکہ زیادہ ضروری

خونِ جگر کی بو ہے، اس مضمون میں یہی جھلک ملتی ہے۔ اس میں خلوص سے اپنی ادبی زندگی کے تجربات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ تجربے نئے نہیں ہیں، مگر سچے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا اثر ہوتا ہے۔

"اس وقت بغیر کچھ جانے اور سمجھے جب کچھ لکھتی تھی تو اپنے اوپر پورا بھروسہ ہوتا تھا اور اب قلم سے کر بیٹھتی ہوں تو جی میں ڈرتی رہتی ہوں کہ جو کچھ لکھ رہی ہوں اس میں نہ جانے کتنی سچائی ہے اور کتنی خیال آرائی۔"

انسانی سیرت حد سے زیادہ پیچیدہ اور اس کا مشاہدہ اور مطالعہ بہت کٹھن اور صبر آزما کام ہے اور اس لئے جب میں اپنے ابتدائی زمانے کے لکھنے اور اس وقت کے لکھنے کا مقابلہ کرتی ہوں تو عجب فرق محسوس ہوتا ہے۔"

ان سطروں کی لکھنے والی کسی کو اپنی قابلیت سے مرعوب کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتی، وہ اپنے دل کی بات بیان کرتی ہے، اُسے اس بات کا احساس ہے کہ ادیب کا کام کتنا مشکل ہے اور کتنا ریاض، کتنا توازن، کتنی بے رنگی اور کتنی رنگینی چاہتا ہے اسے کوئی انوکھی یا سنسنی خیز بات بیان کرکے پڑھنے والے کو جذبات کی رَو میں بہالینا مقصود نہیں ہے۔ اپنے تاثرات کی صداقت اور گہرائی سے پڑھنے والوں کو متاثر کرنا مقصود ہے۔ اس میں کسی چاشنی یا سہارے یا آڑ یا پیترے کے بجائے خلوص اور طبیعت Normality کا حسن ہے۔ یہ حالی کی وراثت ہے۔ او اُردو ادب کو اس روایت سے بڑا فائدہ پہنچا ہے۔

ایک ادیب خاتون کی دلچسپی کے موضوع ادب اور عورت میں ہوسکتے ہیں گو مردوں کو بھی انھیں دو موضوعات سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ صالحہ عابد حسین

ایک درد مند دل رکھتی ہیں۔ وہ ہندوستانی عورت کی پستی اور زبوں حالی کو دیکھتی ہیں۔ اس میں انھیں عورت کا قصور بھی نظر آتا ہے۔ مگر زیادہ تر اسکی ذمہ داری اُن مردوں پر رکھتی ہیں جو اپنی خودغرضی کی وجہ سے عورتوں کو غلام رکھتے ہیں درا صل اسکی ذمہ داری مرد یا عورت پر اتنی نہیں جتنی جہالت اسکی ذمہ دار ہے جیسے جیسے یہاں علم کی روشنی بڑھتی جائے گی۔ رسم ورواج کی زنجیریں اور ظلم واستبداد کی بندشیں ڈھیلی ہوتی جائینگی۔ اور عورتوں (اور مردوں کو بھی) حقیقی آزادی نصیب ہوسکے گی۔ ان کے نزدیک عورت کا جوہر ایثار ہے اور اس کا ماں ہونا اسکی سب سے بڑی خصوصیت۔ اس سے کسے انکار ہوسکتا ہے لیکن عورت کی ایک اور بھی خصوصیت ہے جو سماجی اور گھریلو زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے اور وہ ہے اس کی مزاجوں کو بدلنے اور طبیعتوں میں انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت۔ وہ جوہر انوثیت جو اپنی انتہائی ملکوتی شان سے ایک ماں میں نظر آتا ہے، جو بیوی، بہن، ساتھی، تیماردار معلم سب میں ملتا ہے اور سب کے اثر کو ایک انقلاب آفریں قوت بنا سکتا ہے اس پران کی نظر نہیں گئی۔ میرا خیال یہ ہے کہ عورتوں کو ایثار کی کافی تعلیم دیجاچکی ہے اگر منھ کا مزا بدلنے کے لئے مردوں کو اس کی تلقین کیجائے تو بہتر ہے جس سماج نے عورتوں کی حیثیت کو بلند نہیں رکھا وہ سماج انسانیت کے نصب العین تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ جہاں اسکی گنجایش ہے وہاں ترقی کی بھی گنجایش ہے۔

صالحہ عابد حسین نے عورتوں کی حمایت میں جو کچھ لکھا ہے اسکی صحت میں کسے کلام ہوسکتا ہے، وہ بھی عورتوں کی آزادی، بیداری اور ترقی کی خواہاں ہیں مگر انھیں مغربی ملکوں کی وہ آزادی پسند نہیں جو سماج کی کل بندشوں کو توڑ کر گھریلو زندگی

سے آزاد رہ کر اپنی ذمہ داریوں کو چھوڑ محض فیشن پرستی اور لہو و لعب میں وقت گذارنے کا نام ہے۔ یہ سنکر بعض ترقی پسند خواتین محترمہ کو تاریک خیال سمجھیں گی اور تاریک خیالوں کو اُن کے نئے خیالات ایک آنکھ نہ بھائیں گے۔ دُنیا میں یہ حشر اُن سنجیدہ متوازن اور منصف مزاج لوگوں کا ہمیشہ ہوتا ہے۔ جو کسی تحریک میں آنکھیں بند کر کے نہیں بہہ جاتے، بلکہ اس کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو دیکھتے ہیں۔ دنیا ذرا سہل پسند ہوتی ہے۔ وہ قانون، فارمولوں اور علامتوں کی ضرورت سے زیادہ قابل ہوتی ہے۔ یہ نیا ہے اس لئے اچھا وہ پُرانا ہے اس لئے بُرا۔ یہ مشرقی ہے اس لئے سر پر بٹھانے کے قابل وہ مغربی ہے اس لئے گردن زدنی۔ ایسے سب تصورات سطحی ہیں ہاں ہر سماج میں نئے خیالات کو جذب کرنے اور نئے اثرات کو قبول کرنے کی گنجایش ہونی چاہیئے روایات کی قدر کرنی چاہیئے۔ روایت پرست نہ ہونا چاہیئے۔ یہی مسلک اس کتاب کی مصنفہ کا ہے۔

عورتیں اور آزادی، خالدہ خانم، مصطفےٰ کمال نے عورتوں کے لئے کیا کیا اور اسلام میں عورت کے حقوق، صرف عورتوں کی دلچسپی کی چیزیں نہیں ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ عورت میں نئیں زندگی کا کیسا ترقی پذیر اور صالح تصور رکھتی ہیں۔ وہ عورت کے ان فرائض سے غافل نہیں جو گھریلو زندگی سے متعلق ہیں۔ مگر انھیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ عورتوں کو سماج کے ایک فرد کی حیثیت سے بعض اور خدمات بھی انجام دینی ہیں اور جب تک اس نظام میں خود عورتوں کا حصہ نہ ہو اور ان کی ہمدردی۔ دل سوزی اور انسانیت کارفرما نہ ہو نظام کی بہتری کی

متعلق زیادہ اچھی توقعات قایم نہیں کی جاسکتیں۔گھریلو زندگی زیادہ اہم ہے یا سماجی خدمات۔یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔خود گھریلو نظام زندگی کس حد تک موجودہ صورت میں قایم رہ سکتا ہے اور شادی کی موجودہ صورت جس نے مرد کو عورت پر ہر طرح قبضہ واختیار دے رکھا ہے کس حد تک باقی رہنے والی ہے۔ان مسائل سے یہاں بحث نہیں کی گئی، ان کی یہاں گنجایش بھی نہ تھی۔

کتاب میں محض بات چیت ہی نہیں، ادب بھی ہے۔حالی کے خطوط، اور حالی کا اصلاحی ادب ادبی اہمیت رکھتے ہیں۔اس وجہ سے نہیں کہ یہ اُردو کے ایک بہت بڑے ادیب سے متعلق ہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ اختصار کے باوجود ان میں نہایت خوبی سے حالی کے ادب کے مختلف پہلوؤں کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔یہ کہنا تو صحیح نہیں کہ اُردو میں خط لکھنے غالب نے شروع کیے، کیونکہ غالب سے پہلے سودا اور غلام امام شہید کے مکاتیب ملتے ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خط نہیں ایک طرح کے مضامین ہیں، ان میں مطالب کے اظہار سے زیادہ زور انشاپردازی اور عبارت آرائی پر ہے۔یہ مرعوب و مسحور کرسکتے ہیں۔ذہن میں روشنی نہیں پیدا کرسکتے۔ان میں خیال اہم نہیں انشا اہم ہے۔یہ ادب ہوسکتے ہیں، خط نہیں ہوسکتے۔غالب کے اثر سے سادہ خط لکھنے کا رواج بہت بڑھ گیا۔حالی کے خطوط میں غالب کا یہ اثر بہت نمایاں ہے، مگر ان میں اور غالب کے خطوط میں بہت فرق ہے۔یہ خط باوجود سیدھے، فطری، بےتکلف اور واضح ہونے کے، غالب کے خطوط کی طرح دلچسپ نہیں ہیں، شاید اس وجہ سے کہ غالب کی شخصیت اور حالی کی شخصیت میں فرق ہے۔دونوں کی ظرافت میں فرق ہے۔دونوں کے مزاج میں فرق ہے۔دونوں کے بات کہنے کے انداز میں فرق ہے

غالب پہلی نظر میں اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں، ان کے یہاں ایک مسحور کن شخصیت، ایک بجلی اور تلوار کی سی کیفیت رکھنے والی ظرافت، ایک نہایت پُر کار سادگی ملتی ہے۔ حالی پہلی نظر میں اپنی طرف متوجہ نہیں کرتے، نہ ان کی ظرافت میں اتنی کشش ہے۔ یہ زیرِ لب تبسم سے آگے نہیں بڑھتی، مگر ان کے خلوص، دردمندی اور دوسروں کے لئے بے پایاں محبت اپنی طرف کھینچتی ہے۔ غالب کی دنیا میں صرف غالب جلوہ گر ہیں غالب ہیں غالب کا محبوب ہے۔ غالب کا حلقۂ احباب بڑا وسیع ہے۔ وہ دوستوں کے بغیر جی نہیں سکتے، مگر یہ دوست ان کی دنیا میں بہت زیادہ دخیل نہیں ہیں۔ حالی اس لحاظ سے غالب سے بہت بلند ہیں۔ وہ اپنوں کے لئے نہیں، دوسروں کے لئے جیتے ہیں۔ شرافت، انسانیت، مشرقیت کا صحیح مفہوم حالی کی زندگی اور طرزِ عمل سے واضح ہوتا ہے۔ حالی کے اصلاحی ادب میں بھی ہمیں جا بجا ایک پختہ ادبی شعور کی کارفرمائی ملتی ہے۔ صالحہ عابد حسین نے تسلیم کیا ہے کہ "حالی کی نثر میں صاف سرسید کی تحریر کی شان جھلکتی ہے اور زورِ بیان اُن سے کم ہی، صفائی، سادگی اور گھلاوٹ اُن سے کچھ زیادہ ہی ہے۔" حالی کے یہاں زورِ بیان دیکھنا ہو تو مسدس حالی کا دیباچہ اور دیوانِ حالی کا دیباچہ (مقدمہ کے علاوہ) دیکھئے۔ لیکن عام طور پر حالی زورِ بیان سے زیادہ آئینے کی سی وضاحت اور صفائی پر زور دیتے ہیں۔ سرسید کی عبارت ہموار نہیں ہے۔ حالی سب کچھ ہو سکتے ہیں، ناہموار نہیں ہو سکتے۔ سرسید جو لطف پیدا کرتے ہیں اس میں ظرافت کو بھی دخل ہوتا ہے۔ حالی کا حُسن، خالص ادب کا حُسن ہے اس حُسن کو لوگ اس لئے نہیں پہچان سکتے کہ وہ ادب میں ادب کا حُسن نہیں دوسری خارجی چیزوں کا حُسن ڈھونڈھتے ہیں۔ حالی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہر جگہ

اس کا صحیح منصب عطا کیا۔ لوگوں نے لفظ کو سب کچھ سمجھ لیا تھا اسکے صحیح خیال کو نظرانداز کر رکھا تھا۔ آزاد کے الفاظ میں باندی کو رانی بنا رکھا تھا اور رانی کونے میں مُنھ چھپائے بیٹھی تھی۔ حالی نے لفظ کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے خیال کو اس کا حقیقی منصب دلایا۔

یہی بات خود صالحہ عابد حسین کی تحریر میں ہے۔ وہ خطابت یا جذباتیت کی چاشنی سے کام نہیں لیتیں۔ نہ صنائع و بدائع کے زیور سے اپنے طرز کو آراستہ کرتی ہیں۔ وہ جا بجا اشعار کی مدد سے یا کتابوں اور مقولوں کے سہارے بھی نہیں چاہتیں۔ ان کے یہاں یہ Emotional black-mail نہیں ہے، اچھی نثر لکھنا آسان کام نہیں۔ ہمارے اچھے اچھے لکھنے والے یا تقریر کرنے لگتے ہیں یا بسورنے لگتے ہیں۔ انھیں اپنے اوپر اعتماد نہیں ہوتا، وہ سیدھی سادی عبارت میں اپنا مطلب دوسروں تک نہیں پہونچا سکتے، یا وہ ضرورت سے زیادہ شخصی اور قطعی ہو جاتے ہیں۔ طرز میں شخصی انداز سے انوکھاپن، انفرادیت نیاپن آتا ہے۔ مگر ضرورت سے زیادہ واحد متکلم کا استعمال یا قطعی لب ولہجہ پڑھنے والے پر اچھا اثر نہیں ڈالتا۔ یہ طرز اور جگہ کھپ جائے تو کھپ جائے مضمون نگاری یا انشائے لطیف میں اسکی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ مضمون نگاری کے ہلکے پھلکے سبک اور رواں اسلوب میں کسی ثقیل چیز کا احساس نہ ہونا چاہیئے۔ صالحہ عابد حسین کو کچھ کہنا ہے، مگر وہ اسے سیدھے سادے طریقے سے بیان کر دیتی ہیں۔ ان کا طرز کوئی انوکھا یا نیا طرز نہیں ہے یہ اپنی طرف متوجہ بھی نہیں کرتا۔ ہاں جب آپ پورا مضمون پڑھ لیتے ہیں تو اس کے

دل نشیں اور واضح رنگ کا اثر ہوتا ہے۔ یہی طرز کی خوبی ہے۔ حالی کے طرز کی ایک جگہ انھوں نے ان الفاظ میں تعریف کی ہے۔

"عبارت کی سادگی۔ سلاست اور روانی، معنی کی صحت لہجے کی متانت علمی و ادبی مسائل کو صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں بیان کرنا حالی کا حصہ ہے" اس حصہ میں سے بہت کچھ صالحہ عابد حسین کو بھی ملا ہے۔

آل احمد سرور

رام پور
۱۶ مئی ۱۹۴۹ء

اپنی باتیں

میں نے لکھنا کیسے شروع کیا؟

اگر انسان کسی سڑک پر چلتے چلتے مڑ کر دیکھتا ہے تو کچھ دور پیچھے وہ تنگ نظر آتی ہے لیکن جب وہ غور کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سڑک در اصل وہاں بھی اتنی ہی چوڑی ہے مگر دور سے دیکھنے کی وجہ سے تنگ نظر آتی ہے۔ یہی حال زندگی کی شاہراہ کا ہے۔ جب ہم اپنے بچپن کی باتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہر چیز فاصلے کی وجہ سے چھوٹی نظر آتی ہے۔ مگر اس سے ہمیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کو جس نظر سے ہم اس وقت دیکھ رہے ہیں اس وقت بھی اسی نظر سے دیکھتے تھے۔ جو باتیں اس وقت ہمیں بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہیں اس وقت نہایت اہم دکھائی دیتی تھیں۔ اب بھی اگر ہم یہ سوچیں کہ ہماری موجودہ اور آئندہ زندگی اسی بنیاد پر قایم ہے جو بچپن میں پڑتی تھی تو ہمیں اپنے بچپن کے کاموں کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

جب میں یہ سوچتی ہوں کہ میں نے لکھنا کیسے شروع کیا تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے لیکن اس وقت ہنسی کی بات نہیں تھی بلکہ جب تو میں اپنی مضمون نگاری کو دنیا کی سب سے سنجیدہ چیز سمجھتی تھی کسی کا معمولی سا مذاق یا ہنسی اڑانا بہت برا معلوم ہوتا تھا اور اس سے سچ مچ دلی تکلیف ہوتی تھی۔

یوں تو میں نے لکھنا بہت چھوٹی عمر شاید آٹھ یا اس سے بھی کچھ کم عمر میں شروع کر دیا تھا۔ یعنی اپنی انگریزی کی پہلی کتاب کے ننھے ننھے سبقوں کا ترجمہ اپنی کاپی پر کر کے اپنے کو بڑا مضمون نگار سمجھ لیتی تھی۔

بات یہ تھی کہ میری دونوں بڑی بہنیں رسالوں کے لئے مضمون لکھا کرتی تھیں اور انہیں دیکھ دیکھ کر مجھے بھی شوق اٹھتا تھا۔ لیکن وہ لکھنا جو کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر انشاپردازی کی تعریف میں آسکتا ہے۔ اس کے دو یا شاید تین سال کے بعد شروع کیا۔

لکھنے کے لئے چار باتیں بہت ضروری ہیں۔ شوق، صلاحیت۔ مناسب ماحول، اور زندگی کا مشاہدہ۔

شوق مجھے ابتدا ہی سے بہت تھا۔ صلاحیت تو خدا جانے اب بھی ہے یا نہیں۔ ہاں خوش قسمتی سے ماحول مناسب اور موافق ملا تھا۔ میرے پرنانا مولانا حالی مرحوم میرے والد خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے علاوہ میرے بڑے چچا بھی بہت اچھے لکھنے والے تھے۔ عورتوں میں بھی میری ایک پھوپھی تہذیب کی پہلی مضمون نگار خواتین میں سے تھیں۔ میری دونوں بڑی بہنیں تہذیب ظل السلطان، خاتون اور سہیلی وغیرہ میں مضامین لکھا کرتی تھیں۔ یوں بھی گھر میں اکثر پڑھنے لکھنے کا چرچا رہتا تھا۔ سب نے اپنی اپنی کتابیں جمع کر کے ایک ننھی سی لائبریری بنائی تھی۔ اکثر رات کے وقت گھر کی سب بڑی بوڑھیاں لڑکیاں اور بچے جمع ہو جاتے اور میری منجھلی بہن عورتوں کے مذاق کے قصے اور ناول پڑھ پڑھ کر سنایا کرتیں۔ گھر میں، اور لائبریری میں قصوں کی جتنی کتابیں تھیں وہ میں کبھی اپنی بہن سے مانگ کر اور کبھی چھپا کر پڑھا کرتی تھی اور جتنے رسالے آتے وہ بھی پڑھتی۔ اسی سبب سے مجھے افسانہ لکھنے کا شوق پیدا

ہوا ورنہ ہمارے ہاں عورتوں میں یہ شوق اور کسی کو نہ تھا۔ باقی رہا زندگی کا مشاہدہ تو وہ ظاہر ہے کہ اس عمر میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ جو کچھ کتابوں میں پڑھتی یا سُنتی وہی دماغ میں بس جاتا چنانچہ پہلی چیز میں نے ایک جاسوسی قصّہ لکھا، جو بالکل سُنی سُنائی اور پڑھی پڑھائی باتوں پر مبنی تھا اور جب کیا اب بھی میں اُس موضوع سے قطعاً ناواقف ہوں۔ ایک دس گیارہ سال کی لڑکی جس نے گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نہیں نکالا اور جاسوسی قصّہ! ! اصل میں میری ایک بہن کے نام جاسوس نام ایک رسالہ اور بہت سے جاسوسی ناول آیا کرتے تھے اور میں اُن سب کو پڑھا کرتی تھی۔ بچپن کی عمر، عجیب عزیب باتیں بہت اچھی معلوم ہوئیں، بس لکھ مارا۔ ایک قصّہ اس کا نام انسپکٹر عاصم علی تھا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ اس قصّے میں اتفاقاً انسپکٹر کے پاؤں کے نیچے ایک کیل آجانے سے خفیہ تہ خانے کا دروازہ کھل گیا تھا اور اسی سے اس نے سب ڈاکوؤں کا پتہ چلایا تھا۔ بہت اہتمام سے لٹھے کی تھیلی سی کر اُس میں اس قصّہ کو رکھا اور تھیلی پر جلی حرفوں میں خُفیہ تھیلی لکھ دیا اور گڑیوں میں سب سے چھپا کر رکھتی تھی تاکہ کوئی دیکھ نہ لے اور مذاق نہ اُڑائے۔ مگر آپ جانیں ہم عمر ساتھی تو ستانے کے موقعے ڈھونڈا کرتے ہیں۔ اُنھوں نے پتہ چلا ہی لیا اور خوب خوب چڑایا اور مذاق اڑایا۔ تھیلی کی سیے

میں بدقسمتی سے نقطے دینا بھول گئی تھی لہٰذا بڑے چھوٹے سب اُسے خفیہ تھلی کہہ کر مجھے چڑاتے تھے۔ آج تک میرے بعض ہم عمر ساتھی خفیہ تھلی کا ذکر کرتے ہیں۔

کچھ دن بعد میرے بڑے بھائی خواجہ غلام السیّدین، جو کئی سال سے یورپ گئے ہوئے تھے، واپس آئے اور اُنھوں نے میرے لکھنے کے شوق کو دیکھ کر میری ہمت افزائی کی۔ نداق وہ بھی کرتے تھے۔ مگر ان کے نداق میں ہمدردی کا رس تھا۔ ان کا نداق اصلاح کے لئے ہوتا تھا۔ ہمت پست کرنے کے لئے نہیں، انھوں نے ہم بچوں کی ایک انجمن سی بنائی جس میں ہر آٹھویں دن کسی بزرگ کی صدارت میں جلسہ ہوا کرتا تھا اور ہم سب لڑکے لڑکیاں اس میں نظمیں پڑھتے، مضمون سناتے اور تقریریں کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں منشی پریم چند کے افسانوں کی دو کتابیں پریم پچیسی اور پریم بتیسی شایع ہوئی تھیں۔ بھائی جان اکثر سب چھوٹے بڑوں کو بٹھا کر پریم چند کے قصّے سناتے اور کبھی کبھی قصّے کو ادھورا چھوڑ کر ہم سے کہتے کہ اسے پورا کرو۔ پریم چند کے بعض قصّے ایسے ہوتے ہیں جیسے بیچ میں چھوڑ دیئے گئے ہوں۔ ایک ایسا قصّہ بھی پورا کرایا تھا۔ ہم سب لکھ لکھ کر انھیں دکھاتے اور وہ اصلاح دیتے تھے۔ میرا خیال ہے اس میں زیادہ انہماک مجھی کو تھا۔ اسی زمانے میں میری دو ہمجولیوں نے اور میں نے آپس میں یہ طے کیا کہ ایک

ایک قصہ لکھیں۔ بہت اہتمام سے اپنے ہاتھوں سے کاپیوں کی جلدیں باندھی گئیں۔ رنگین پنسلوں سے سطریں اور حاشیہ کھینچا گیا، اور پھر قصے لکھے گئے۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میری ان دو سہیلیوں کے قصوں میں ہیروئن کی شادی اپنے چچا زاد بھائی سے ہوئی تھی، اور میری ہیروئن کسی غیر شخص سے بیاہی گئی تھی۔ یاد نہیں کب، لیکن کچھ عرصے بعد کوئی چھوٹا موٹا مضمون تہذیب میں شایع ہوا۔

۱۹۲۹ء میں انگریزی کے ایک قصے کا چربا ایک افسانے میں اتارا اور وہ افسانہ چھپنے کے لئے نور جہاں میں بھیجا جسے مدیر نے پسند کر کے چھاپ دیا۔ یہ میرا پہلا افسانہ تھا جو شایع ہوا۔ میری اور ادیب بہنوں کو اس خوشی کا اندازہ ہوگا جو پہلا افسانہ چھپنے سے ہوتی ہے۔ بچپن میں شاید یہ خیال ہوتا ہے کہ کسی چیز کا چھپ جانا اس کے اچھے ہونے کا سارٹیفکٹ ہے۔ افسوس ہے کہ اب یہ حسنِ ظن باقی نہیں رہا

اس کے بعد نور جہاں، سہیلی، تہذیب، عصمت اور کئی سال بعد ساقی میں بھی افسانے، ڈرامے اور مضمون چھپتے رہے۔ اس زمانے میں افسانے اور ڈرامے زیادہ تر اس طرح لکھتی تھی کہ کوئی چشم دید واقعہ دل پر اثر کر گیا، یا کسی کی دکھ بھری کہانی یا دلچسپ داستان سنتی تو اس کا افسانہ بنا لیتی تھی۔ پریم چند سے مجھے بہت عقیدت تھی (اور ہے) ان کے افسانے پڑھ پڑھ کر شوق اٹھا تو کئی قصے خود بھی ایسے لکھے جس میں دیہاتی زندگی، اور سیاسی زندگی دکھائی گئی تھی، اور

جن میں ترکِ موالات، عدم تعاون، جلوس اور قید خانے اور نہ جانے کن کن چیزوں کا ذکر تھا۔ مگر چونکہ پریم چند کے قصّوں کے مقابلے میں وہ اپنی ہی آنکھوں میں نہیں جچے اِس لئے کہیں چھپنے کو نہیں بھیجے، اور کئی سال بعد پھاڑ ڈالے۔

۱۹۲۸ء میں میری والدہ اور ۱۹۲۹ء میں میری بہن کا انتقال ہوا جس کا مجھ پر بہت اثر تھا۔ ۱۹۳۰ء میں میں نے ایک چھوٹا سا ناول لکھا، اُس میں یہی اثر چھایا ہوا تھا۔ میرے بھائی نے ناول دیکھ کر اصلاح دی اور بہت ناپسند نہیں کیا، مدتوں یہ پڑا رہا۔ چند سال بعد جب میں نے دوبارہ اُسے تنقید کی نظر سے دیکھا تو اس میں ذاتی مشاہدے اور اصل زندگی کی تصویر کم نظر آئی اور نقالی زیادہ۔ یعنی وہی دولت و ثروت، زیور و جواہرات کی فراوانی، حسن کی ارزانی، اعلیٰ ترین کیرکٹر، عجیب و غریب اتفاقات، غیر فطری سیرت نگاری وغیرہ جو ہماری اکثر کتابوں کی جان ہیں، اور لطف یہ کہ جن کتابوں کی نقالی تھی وہ خود بھی اعلیٰ پایہ کی نہ تھیں چنانچہ میں نے اس ناول کو پھاڑ ڈالا۔ اگرچہ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر وہ چھپ جاتا تو ان کتابوں سے کم مقبول نہ ہوتا، جن کا وہ چربا تھا، کیونکہ ہمارے زنانہ ادب کی اکثر کتابیں دوسری کتابوں کی کامیاب یا ناکامیاب نقلیں ہی تو ہیں۔ یاد رکھئے میں نے اکثر کتابیں کہا ہے، سب نہیں۔

میری عادت ہمیشہ سے یہ تھی کہ جب کوئی مضمون یا قصّہ لکھنے کو جی چاہا، کوئی پلاٹ ذہن میں آیا اور لکھنے کا موقع بھی مل گیا تو بیٹھ کر بے تکان

لکھتی چلی جاتی۔ قلم اس روانی اور تیزی سے چلتا کہ بعض لوگ کہا کرتے تھے
کہ تم لکھتی ہو یا نقل کرتی ہو؟ دماغ پر زور ڈالنے، سوچنے اور پہلے سے سب
خیالات مرتب کرنے کی عادت ہی نہ تھی، اور اس طرح لکھنے والوں میں جو
نقائص ہوتے ہیں وہ بھی خدا کے فضل سے سب موجود تھے (اور شاید
اب بھی ہوں) لیکن خوش نصیبی سے شادی کے بعد، مجھے شریک زندگی
بہت اچھا ادیب اور ادب کا بہترین مذاق رکھنے والا ملا۔ اُن سے مجھے
اپنے لکھنے میں بہت مدد ملی۔ انھوں نے مجھ میں ادب کا پہلے سے بہتر اور
ستھرا مذاق پیدا کیا اور مجھے میرے نقائص سے آگاہ کیا۔ بے سوچے
سمجھے قلم برداشتہ لکھنے کو خوبی نہیں بلکہ عیب بتایا اور بار بار تاکید کی
کہ جو کچھ لکھوں پہلے سے سوچ سمجھ کر اور خیالات مرتب کر کے لکھوں۔
اگرچہ یہ عیب تھوڑا بہت اب بھی مجھ میں باقی ہے، لیکن اب میں اپنی بعض
اور ادیب بہنوں کی طرح اس پر فخر نہیں کرتی بلکہ کوشش کرتی ہوں کہ
اس عادت کو چھوڑ دوں، اسی لئے تین سال پہلے جب میں نے نقش اوّل
مرتب کی تو اپنے بہت سے افسانوں اور ڈراموں میں سے بارہ کا
انتخاب کیا۔ ابتدائی مشق کی چیزیں چھپوانے کو جی نہ چاہا کہ جو خود مجھے پسند
نہیں وہ دوسروں کے سامنے کیا پیش کروں۔

میں جوں جوں غور کرتی مجھے نہ صرف اپنی تحریروں میں بلکہ عام طور
پر زنانہ ادب میں ذاتی مشاہدے کی کمی محسوس ہوتی۔ بعض لوگوں کا خیال
ہے کہ ہندوستانی عورتوں کے لئے زندگی کا مشاہدہ نہ ہونے کے برابر ہے

یہاں تک باہر کی دنیا کا تعلق ہے یہ بات ایک حد تک صحیح ہے لیکن کائنات میں جو چیز سب سے زیادہ اہم اور قابل مطالعہ سمجھی گئی وہ انسانی سیرت ہے اور اس کے مطالعے کے موقعے عورتوں کو بھی اپنی محدود دنیا میں بخوبی حاصل ہیں۔

میں نے بھی جب ہوش سنبھالا اور غور سے آس پاس کی دنیا کو دیکھنے کی اور مشاہدے کی عادت ڈالی تو اسی محدود دائرے میں بہت کچھ دیکھا عزیز ترین ہستیوں کی ابدی مفارقت دیکھی اور ان کی عزیز یاد کو زندگی کا گراں بہا سرمایہ پایا۔ بیماریاں اور پریشانیاں دیکھیں۔ خوشی اور راحت دیکھی۔ سلوک و اتفاق، لڑائی جھگڑے، محبت اور نفرت کے نظارے دیکھے۔ خود غرضی اور تن پروری دیکھی، خلوص اور ایثار دیکھا محبت کے پردے میں نفس پرستی اور خود مطلبی دیکھی، سختی اور کھرے پن میں خلوص اور ہمدردی کا جلوہ دیکھا، بیماریوں اور تکلیفوں میں انتہائی صبر و استقلال دیکھا، اور تندرستوں میں بیمار بننے کا شوق دیکھا۔ دین داری کے بھیس میں مردم آزاری دیکھی اور دنیا داری کے پردے میں نوع انسانی کی محبت اور خدمتِ خلق کا شوق دیکھا، فراغت میں ہوس اور کنجوسی دیکھی اور غربت میں قناعت اور سخاوت دیکھی، مذہب کے نام پر رسم و رواج کی پرستش دیکھی، سرمایہ داری کے مظالم اور غریبوں کی برداشت دیکھی۔ عورتوں کی جہالت اور بے عملی دیکھی اور مردوں کی بے حمیتی اور بے حسی دیکھی، بچوں کی ناقص تربیت اور نکمی تعلیم اور

نوجوانوں کی فیشن پسندی اور مغرب پرستی دیکھی سستی شہرت کے لئے ناروا کوششیں دیکھیں اور خاموش عملی خدمات دیکھیں........
اور پھر..........جاہلوں میں سچی ہمدردی اور انسانیت کی اعلیٰ خوبیاں اور صاحبانِ علم میں حیوانوں کی سی خصلتیں بھی دیکھیں۔ بھائی کو بھائی کا دشمن دیکھا اور دشمنوں کو آپس میں بھائیوں جیسا برتاؤ کرتے دیکھا۔..
........کیا کیا نہ دیکھا اور کیا کیا نہ دیکھوں گی۔

لیکن ان سب کو دیکھنے، سمجھنے اور سوچنے کے بعد جو بات معلوم ہوئی وہ صرف اتنی کہ انسانی سیرت حد سے زیادہ پیچیدہ اور اس کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت کٹھن اور صبر آزما کام ہے۔ اور اسی لئے جب میں اپنے ابتدائی زمانے کے لکھنے اور اس وقت کے لکھنے کا مقابلہ کرتی ہوں تو عجیب فرق محسوس ہوتا ہے اس وقت بغیر کچھ جانے اور سمجھے جب کچھ لکھتی تھی تو اپنے پر پورا پورا بھروسہ ہوتا تھا اور اب قلم لے کر بیٹھتی ہوں تو جی میں ڈرتی رہتی ہوں کہ جو کچھ لکھ رہی ہوں اس میں نہ جانے کتنی سچائی ہے اور کتنی خیال آرائی؟

بہرحال اب کوشش یہ کرتی ہوں کہ انسان کی زندگی اور سیرت کو ہمدردی سے دیکھوں اور سچائی سے دکھاؤں۔ اپنے قصے کے کرداروں سے اس طرح گھل مل جاؤں کہ ان کے دکھ سکھ کو اپنا دکھ سکھ سمجھوں، اگر اس کوشش میں تھوڑی سی کامیابی

بھی نصیب ہو تو میری محنت سوارت ہو جائے۔

کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ جس طرح اب مجھے لڑکپن کی لکھی ہوئی چیزیں بچوں کا سا کھیل معلوم ہوتی ہیں شاید ایک دن ایسا آئے کہ جو کچھ اب لکھتی ہوں وہ بھی اسی طرح بچوں کا کھیل معلوم ہو؟

اُستانی جی

آج کل تقریباً ہر شہر اور قصبے میں اور کہیں کہیں گاؤں میں بھی لڑکیوں کے لئے پرائمری اور مڈل اسکول کھُل گئے ہیں۔ بعض بڑے شہروں میں ان کے لئے ہائی اسکول اور کالج بھی موجود ہیں۔ اس لئے آج بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنھیں ان گھریلو مکتبوں کا بھی کبھی خیال آتا ہو جو اب سے چالیس پچاس برس پہلے تمام ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ اب تو اگر کبھی ان مکتبوں کا ذکر بھی آجاتا ہے تو ہم لوگوں کے ذہن میں ایک بھیانک تصویر کھنچ جاتی ہے جس کے بیچ میں ایک ظالم اور ڈراؤنی صورت کی اُستانی بیٹھی ہوتی ہے جو بات بے بات لڑکیوں کو مارتی پیٹتی ہے اور ہر قسم کے ظلم جو اس کے امکان میں ہوتے ہیں ان بچاری لڑکیوں پر ڈھاتی ہے، اپنے گھر کا سارا کام، جھاڑ پونچھ، بچوں کی دیکھ بھال، کھانا پکانا سب ان ہی معصوم لڑکیوں سے کراتی ہے اور پھر اس کے صلے میں ذرا سی غلطی پر ان کو ادھیڑ کر رکھ دیتی ہے۔ پڑھنا پڑھانا برائے نام ہی ہوتا ہے۔ مگر میرا کہنا یہ ہے کہ

یہ تصویر جو آپ کے ذہن میں سُنی سُنائی باتوں کی وجہ سے آتی ہے صحیح نہیں۔ ان باتوں میں رنگ آمیزی بہت ہوتی ہے۔ چونکہ ہم لوگ نئی تہذیب اور نئی معاشرت کے دلدادہ ہوتے جاتے ہیں اس وجہ سے ہمیں پُرانی تہذیب کی اور یادگاروں کی طرح ان مکتبوں سے اور قدیم وضع کی اُستانیوں کی طرف سے بھی بدظنی ہوگئی ہے اور ہم دل میں خوش ہوتے ہیں کہ خدا نے ہمیں اس تاریک زمانے میں نہیں بلکہ روشنی اور تہذیب کے اس دَور میں پیدا کیا۔ لیکن تعصب دور کرکے ہمیں اچھی اور بُری چیزوں میں انصاف کے ساتھ تمیز کرنی چاہیئے۔ خواہ وہ نئے زمانے کی ہوں یا پُرانے زمانے کی۔ تصویر کا ایک رُخ دیکھنا اور دوسرے کو نظر انداز کر دینا عقلمندی نہیں۔ ہر نئی چیز اچھی نہیں ہوتی اور ہر پُرانی چیز میں محض خرابیاں نہیں ہوتیں۔ یہ "استانی جی" اس وقت کی یادگار ہیں جب سرکاری مدرسے بہت کم تھے۔ لڑکیاں فیشن کے خیال سے نہیں پڑھتی تھیں اور اُستانیاں تنخواہ کی وجہ سے نہیں پڑھاتی تھیں ٹریننگ کی شرط نہ تھی، انسپکٹر کا معائنہ نہ تھا، رجسٹر نہ تھے، کرسیاں میزیں اور نقشے نہ تھے، نمائش اور نمود نہ تھی۔ اکثر بڑی بوڑھی عورتوں کو خدا واسطے یہ خیال پیدا ہوتا کہ پاس پڑوس کی لڑکیوں کو، جن میں امیر غریب سب ہی شامل ہوتیں، کچھ اللہ رسول کا نام، کچھ لکھنا پڑھنا کچھ سینا پرونا، کچھ پکانا رِیندھنا سکھائیں اور انھیں اپنا گھر بار چلانے کے قابل بنا دیں۔ شاید اس میں یہ خیال بھی پوشیدہ ہوتا ہو کہ اس طرح

ایک مکتب گھر پر قایم کر کے بہت سی لڑکیوں پر حکومت چلانے اور اپنی حکومت کی خواہش کو پورا کرنے کا موقع بھی ملے گا لیکن اس غرض کو شاید وہ خود بھی صاف صاف نہ سمجھتی ہوں گی ان کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی تھی کہ یہ کام ثواب کی خاطر کریں اور اپنے آس پاس کے بچے اور بچیوں کو فائدہ پہنچائیں۔

برخلاف اس کے آج کل کی اکثر اُستانیوں کو لیجئے تو ان میں زیادہ تر دو قسم کی اُستانیاں نظر آتی ہیں۔ ایک تو وہ جو لوگوں کے گھروں پر جاکر لڑکیوں کو گھنٹے دو گھنٹے سبق دیتی ہیں اور اپنا کام ختم کر کے واپس اپنے گھر چلی جاتی ہیں۔ دوسری وہ جو اسکولوں میں تعلیم دیتی ہیں جو مقررہ وقت پر مدرسہ جاتی ہیں اور اسکول ختم ہوتے ہی اپنے گھر کی راہ لیتی ہیں پہلی قسم کی اُستانی کی عزت عام طور پر لڑکیوں کے دل میں بالکل نہیں ہوتی۔ ان کے مغرور دماغ میں یہ خیال سما جاتا ہے کہ جیسے ہمارے گھر میں اور نوکر ہیں اسی طرح یہ اُستانی بھی ہے۔ ہم اس کو تنخواہ دیتے ہیں اور یہ ہمیں پڑھا دیتی ہے۔ استانی بھی مقررہ وقت پر آتی ہے، جتنا وقت اس نے پہلے سے طے کر لیا ہے اتنی دیر لڑکی کو پڑھا کر چلی جاتی ہے۔ اُسے لڑکی کے عادات واطوار سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور بعض اوقات اتنی مجال بھی نہیں ہوتی کہ لاڈلی صاحبزادی کو کچھ کہہ سکے۔ رہا اسکول تو اُس سے اور وہاں کی استانیوں سے بھی وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو تھوڑی بہت مقدرت رکھتے ہوں کیونکہ اسکول کی فیس ڈولی یا تانگہ کا کرایہ، طرح طرح کے جرمانے اور چندے لازمی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے وہ کروڑوں فاقہ کش

لوگ جنھیں پیٹ بھر کر روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی. ان اسکولوں سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ پھر یہاں لڑکیوں پر تاکید رہتی ہے کہ مہینے کی فلاں تاریخ تک فیس داخل ہو جائے ورنہ جرمانہ اور پھر نام خارج ہو جائے گا۔ اب چاہے ماں باپ فاقے سے بیٹھے ہوں مگر لڑکی کی فیس کہیں نہ کہیں سے داخل کرنی ضروری ہے ورنہ اُس کی تعلیم سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اس کرایہ کی تعلیم میں اُستانی کو عام طور پر اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ وہ لڑکی کی تربیت، یا اخلاق و عادات کی طرف ذرا بھی توجہ کرے۔ اس کو اس سے مطلب نہیں ہوتا کہ یہ لڑکی خانہ داری کا کچھ کام جانتی ہے یا نہیں، گھر پر اس کی تربیت ٹھیک ہوتی ہے یا نہیں۔ اس کا تو صرف یہ کام ہے کہ وہ اپنے مقررہ وقت پر اپنا مقررہ مضمون پڑھائے اور اگلے دن سبق سُن لے اور لڑکیوں کو کلاس میں شور و غل نہ کرنے دے۔ اس صورت میں اُستانی اور شاگرد میں کسی روحانی رشتے کا قایم ہونا تقریباً نا ممکن ہے۔ اُستانیاں سمجھتی ہیں کہ ہمارا فرض بس اتنا ہے کہ لڑکیوں کو امتحان میں پاس کرا دیں۔ لڑکیاں خیال کرتی ہیں کہ سبق یاد کر کے اُستانی کو سُنا دینا ہی کافی ہے۔ پیٹھ پیچھے اُستانی کی عزت یا اُس سے حقیقی محبت بہت کم لڑکیوں کو ہوتی ہے۔

آئیے اب آپ کو ایک پُرانی وضع کی اُستانی جی سے ملاؤں۔ میری ایک بزرگ نے ان اُستانی جی سے پڑھا تھا، اور میں نے بھی اپنے بچپن کے زمانے میں انھیں دیکھا تھا جب کہ وہ چراغ سحری تھیں۔ معتبر لوگوں کی زبانی سُنی ہوئی باتوں سے اور کچھ اپنی یاد سے ان کی زندگی کا مرقع آپ کو دکھاتی ہو

ایک اوسط درجے کا مکان ہے۔ خاصا فراخ صحن، وسط میں دالان در دالان، اگلے دالان کے پہلوؤں میں صحنچیاں، پچھلے دالان کے دونوں پہلوؤں میں دو کوٹھریاں۔ صحن میں ایک طرف باورچی خانہ، غسل خانہ اور ڈیوڑھی ہے۔ دوسری طرف اِک درا اور چھت پر جانے کا زینہ ہے۔ چھت پر ایک کوٹھا بنا ہے جس میں گیہوں، مکئی، پیاز، گھڑے، ٹھلیاں وغیرہ رکھی ہیں۔ کوٹھے کے آگے پھونس کا چھپر بھی ہے۔ جو برسات میں پلنگ کھڑے کرنے کے کام آتا ہے۔

اندر کے دالان میں صاف شفاف چاندنی بچھی ہوئی ہے۔ ایک بڑا گاؤتکیہ جس پر سُرخ قند کا بیل پتّی کے کام کا غلاف چڑھا ہے، رکھا ہوا ہے۔ فرش کے ایک طرف کوٹھری کے سامنے ایک لکڑی کا تخت بچھا ہے، جس پر دری کی جانماز، اور قلعی دار لوٹا رکھا ہے۔ تخت کے نیچے سلاپچی بھی رکھی ہے۔ کوٹھری میں اُستانی جی کا پلنگ، الماری میں قرآن شریف اور ایک کیل میں تسبیح لٹکی ہے۔ صبح مُنہ اندھیرے اُستانی جی کلمہ پڑھتی ہوئی اٹھتی ہیں اور ضروریات سے فارغ ہو کر نماز پڑھتی ہیں اور اس کے بعد دیر تک وظیفے میں مشغول رہتی ہیں۔ لیجئے صبح کی ہلکی ہلکی روشنی جھلکنے لگی۔ آئیے ذرا اُستانی جی کی صورت تو دیکھیں۔ ان کا قد خاصا لمبا اور ڈیل بھاری ہے۔ بڑھاپے کی وجہ سے کمر میں قدرے خم آگیا ہے رنگ کبھی تو خاصا صاف ہوگا مگر اب تو زمانے کا سرد و گرم دیکھتے دیکھتے سانولا پڑ چکا ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور بڑھاپے کے باوجود خوب

چمک دار ہیں اور ایک نظر میں دل تک اُتر جاتی ہیں، ہاتھوں اور چہرے پر باریک باریک جھریاں پڑ گئی ہیں۔ چہرے پر بڑا کا رعب ہے۔ کسی بچی کی تو یہ ہمت نہیں ہو سکتی کہ بے باکی کے ساتھ آنکھ سے آنکھ ملا کر ان سے بات کر سکے۔ سفید بالوں کی خوب کسی ہوئی چوٹی ڈگندھی ہے جس میں لال موباف عجب بہار دیتا ہے۔ انگلیوں کے پوروؤں کو مہندی بھی لگی ہے کیونکہ استانی جی کا عقیدہ ہے، سفید ناخونوں والے ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے جائیں تو ان کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ لٹھے کا سفید پاجامہ، تین سلائی کا تن زیب کا کرتا اور ململ کا سفید ہی دوپٹہ، پاؤں میں سُرخ نری کی بیٹھی ہوئی جوتی ہر چیز سے تمیز اور سلیقہ ظاہر ہوتا ہے۔

ابھی اُستانی جی وظیفہ میں ہی مشغول تھیں کہ لڑکیاں آنی شروع ہو گئیں ذرا کھاتے پیتے گھروں کی لڑکیاں ڈولیوں سے اُترنے لگیں۔ قصائی، کنجڑے تیلی، دھوبی وغیرہ کی لڑکیاں ویسے ہی پیدل سڑ پٹر کرتی پہنچ گئیں۔ لڑکیوں نے دیکھا، اُستانی جی وظیفہ میں مشغول ہیں تو موقع غنیمت جان آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ کھُسر پھُسر کی آواز جو اُستانی جی کے کان میں پہنچی تو اُنھوں نے مُنہ پھیر کر بڑے زور سے "ہوں" کی۔ اُستانی جی کی "ہوں" نے تازیانے کا کام کیا۔ لڑکیاں سہم گئیں۔ جلدی جلدی کسی نے جھاڑو دینی شروع کی، کوئی بستر اٹھانے لگی۔ ایک نے جھاڑن لے کر چیزوں، اور طاقوں وغیرہ کو جھاڑا، دو ایک باورچی خانے کی طرف متوجہ ہوئیں۔ کسی نے کنوئیں سے پانی بھرا، ایک گھڑا دھونے لگی۔ دوسری نے کٹورے لوٹے

مانجھنے شروع کر دیئے۔ غرض سب کی سب کسی نہ کسی کام میں مشغول ہو گئیں۔ دو تین
لڑکیاں کام سے جان بچا کر ایک درے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ کام کرنے
والی لڑکیاں کام کرتی جاتی ہیں مگر کبھی کبھی گردن پھیر کر استانی جی کو بھی دیکھ
لیتی ہیں اور چپکے چپکے ایک آدھ بات کر لیتی ہے اور دل میں کڑھ بھی رہی ہیں
کہ وہ تینوں کیا مزے سے کام سے بچی باتیں کر رہی ہیں۔ ابھی لڑکیاں پورے
طور پر کام سے فارغ نہیں ہوئی تھیں کہ استانی جی وظیفہ ختم کر کے اٹھیں
دوڑ کر ایک لڑکی نے جوتیاں سامنے رکھیں اور ذرا جھجکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
”استانی جی وہ دیکھئے، آپا محمودہ، چھٹو اور بندی وہاں بیٹھی باتیں کر رہی ہیں کام
نہیں کرتیں۔“ استانی جی نے لڑکی کو اس طرح گھورا کہ اس کی جان ہی نکل
گئی۔ ”کیوں ری فیضن تو چغلی کھائی نہیں چھوڑے گی۔ مردار چغل خور، خدا کی
چور، دوزخ کی چھپکلی، دفع ہو یہاں سے۔“ فیضن تو ڈانٹ سنتے ہی بھاگی اور
اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ مگر وہ لڑکیاں جن کی شکایت ہوئی تھی اپنی
جگہ سہم کر رہ گئیں۔ قبل اس کے کہ وہ نظر بچا کر کسی کام میں لگ جائیں
استانی جی کی نظر عنایت ادھر ہو گئی۔ ”ادھر آؤ تم تینوں۔ کیوں ری محمودہ
تو نہیں مرے گی؟ اللہ اللہ دماغ تو دیکھو۔ کسی کام کو ہاتھ ہی نہیں
لگایا جاتا۔ سمجھتی ہو گی امیر باوا کی بیٹی ہوں۔ میں کیوں کام کروں۔ ارے
خدا جانے قسمت میں کیا لکھا ہے۔ میرا کہا ہے نہ کر کام۔ جب گھر بار
کی ہو گی تو یہ دن یاد کرے گی اور سر پکڑ کر روئے گی کہ استانی جی
کا کہنا نہ مانا ورنہ یہ دقتیں کاہے کو ہوتیں۔ اور اسے چھٹو اور بندی

کو کیا ہوا۔ یہ بھی کسی کام کی نہ رہیں۔ یہ تیلی کی چھوکریاں محمودہ اور بسیگم کی صحبت میں بالکل برباد ہوئی جا رہی ہیں۔ خبردار جو اب میں نے تمہیں ان دونوں کے پاس بیٹھا دیکھا۔"

لڑکیاں سر جھکائے کھڑی رہیں، محمودہ نے رونا بھی شروع کر دیا، استانی جی کی ڈانٹ ختم ہوتے ہی لڑکیاں بھاگیں اور کام میں مشغول ہو گئیں، ایک نے مصالحہ پیسا، دوسری نے ٹکیاں پکائیں تیسری چٹنی پیسنے لگی۔ اور دم بھر میں استانی جی کا ناشتہ یعنی گھی کی دو ٹکیاں اور لہسن کی چٹنی ان کے سامنے لا کر رکھ دیا گیا۔ ایک لڑکی جا مکئی کے دانے بھنا لائی، اور استانی جی کے اشارے سے بہت سی لڑکیاں اپنا روزمرہ کا ناشتہ مکئی کی کھیلیں کھانے لگیں۔ جو ذرا خوش حال گھرانے کی تھیں انھوں نے اپنی اپنی پوٹلی کھولی اور گھی کی ٹکیاں باسی سالن سے ساتھ کھانے لگیں۔ نو بجتے بجتے لڑکیاں سب کاموں سے فارغ ہو گئیں۔ ہانڈی پکا دی، آٹا گوندھ دیا، روٹی ڈالنی چاہتی تھیں۔ کہ استانی جی کا حکم ہوا کہ پڑھنا شروع کرو۔ لڑکیاں تیر کی طرح بھاگیں، اور اپنے اپنے سیپارے کھول کر پڑھنے بیٹھ گئیں۔ استانی جی کا انتظام یہ تھا کہ غریب محنت مزدوری کرنے والے خاندانوں کی لڑکیاں الگ درے میں بیٹھتی تھیں اور اچھے خاندانوں کی لڑکیاں اگلے دالان میں دری کے اوپر۔ استانی جی اپنی وضعداری اور لوگوں کے خیالات کی وجہ سے لڑکیوں کو اس طرح الگ الگ ضرور بٹھاتی تھیں لیکن کام لینے، پڑھانے لکھانے میں کبھی فرق نہیں

کرتی تھیں۔ گھر کا کام سب مل جل کر کرتیں، مار کھانے میں سب کا برابر کا حصہ تھا، کبھی انھوں نے کسی معمولی گھرانے کی لڑکی کو حقیر ذلیل نہیں سمجھا۔ ہاں ویسے خدا بخشے ان کی زبان خوب چلتی تھی۔ اری او کنجڑن، اری تیلی کی بچی، دال تیری کچی، کیوں ری غبلاہی تیری عقل تو ہمیشہ گڑھے ہی میں رہے گی۔ لیکن ان کے لہجے میں طنز یا حقارت نہ ہوتی تھی۔ کبھی غصہ ہوتا کبھی تھوڑی سی شفقت، ہاں جب کبھی کسی امیر گھر کی لڑکی سے کوئی خطا ہوتی تو اس کی بری طرح خبر لیتی تھیں اور سات پشت تک کے بخیئے اُدھیڑ کر رکھ دیتی تھیں۔ "یہ نہ سمجھو کہ باپ ڈپٹی ہیں اور دادا وزیر تھے۔ سارا ڈپٹی پنا اور وزیر پنا نکال دوں گی۔ لو اللہ کی شان، لڑکی سے کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔ بیوی بنو یہاں تو چولھا جھونکنا، جھاڑو دینا اور مصالحہ پیسنا، سب ہی کچھ کرنا پڑے گا، اگر ایسا کرتے تمہارے ہاتھ ٹوٹتے ہیں تو ڈولی بڑھاؤ۔ کہہ دینا اپنی اماں سے کہ مجھے ایسی لڑکی کو پڑھانا منظور نہیں۔" لیکن کیا مجال لڑکی یا ان کی اماں جان کی کہ چوں بھی کرتیں۔ ہاں تو کہہ دیتی، کہ "استانی جی جان تو خدا کی ہے، ہڈی بوٹی تمہاری ہے، جو چاہے کرو میں نے تو بچی تمہارے سپرد کر دی ہے۔" اور وہ کہتی کیوں نہ۔ اُستانی جی کسی سے تنخواہ نہ پاتی تھیں، کسی کی دبیل نہ تھیں، کسی کی خوشامد نہ کرتی تھیں اپنے گھر میں بے روک ٹوک حکومت کرتی تھیں، اگر کبھی عید بقرید یا کسی اور موقعہ پر کوئی کسی بہانے سے انھیں کچھ دے دیتا اُسے لے لیتی تھیں، اگر نہ دیتا تو انھیں شکایت نہ ہوتی تھی۔ آمدنی بہت تھوڑی سی تھی مگر قناعت

عجب چیز ہے، وہ اسی میں راج کرتی تھیں اور لڑکیوں پر رعب قایم رکھتی تھیں۔

غرض استانی جی کے حکم کے ساتھ پچیس تیس لڑکیوں نے ہل ہل کر زور زور سے پڑھنا شروع کر دیا۔ بڑی لڑکیوں کو ایک ایک کر کے بلایا گیا، ان کا سبق سنا، آگے سبق پڑھایا، اگر کسی لڑکی سے قرآن شریف پڑھتے میں کوئی غلطی ہو گئی تو اس کے چٹکی لی یا پنکھا رسید کیا۔ "اری کمبخت دوزخ کا کندہ بنے گی دوزخ کا۔ یہ خدا کا کلام پڑھ رہی ہے یا کوئی کہانی کی کتاب، کہ جو منہ میں آیا بک دیا، اگر ذرا سی زیر زبر کی غلطی ہوئی تو معنی کچھ کے کچھ ہو جائیں گے اور فرشتے اپنی کتاب میں لکھ لیں گے، پھر قیامت کے دن تیری تو مٹی پلید ہونی ہی ہے، مگر میں بھی گھسٹی گھسٹی پھروں گی کہ استانی نے غلط پڑھایا تھا۔" اور واقعہ یہ ہے کہ وہ یہ باتیں خلوص سے کہتی ہوں یا مصلحتاً بڑھا کر بیان کرتی ہوں، لڑکیوں پر بڑا اثر ہوتا تھا اور وہ اپنے مقدور بھر قرآن پڑھنے میں غلطی نہیں کرتی تھیں۔ جب بڑی لڑکیوں کا سبق ہو چکا تو انھیں حکم ملا کہ جاؤ اب چھوٹی بچیوں کا سبق سنو اور انھیں آگے سبق دو۔

چلئے پانچ چھ لڑکیوں نے استانی جی کا خلیفہ بن کر مدرسہ سنبھال لیا اور سارا گھر بچوں بچیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ استانی جی نے اپنی پن کٹی نکالی۔ اس میں بہت احتیاط سے پان کوٹا اور ہتھیلی پر لے کر منھ میں ڈال لیا، کوٹھری میں سے کچھ کپڑا نکالا اور اسے سینے بیٹھ گئیں۔ بیچ بیچ

اگر کسی بچی کی کوئی غلطی سنائی دی تو وہیں سے ڈانٹ بتائی "کیوں ری رشیدہ نالائق، صحیح لفظ نہیں بتاتی۔ نہیں بیٹی اس طرح نہیں، یوں پڑھ" ایک روئی کی صدری ادھ سلی رکھی تھی اُسے پورا کیا اور ایک یتیم بچی کو آواز دی "رحیمن یہاں آ" وہ آئی تو کہا "کم بخت صبح سویرے سردی میں اکڑتی آتی ہے۔ لے یہ پہن لے اور جاڑے بھر روز صبح کو ضرور پہنا کیجیو۔ مگر دیکھ اگر تو نے اسے پھاڑا یا سیاہی گرائی تو سر توڑ دوں گی" غریب لڑکی جو ٹھنڈی ہوا میں بیٹھی سوں سوں کر رہی تھی خوش خوش جا کر سبق پڑھنے لگی اور نظر بچا کر پاس بیٹھی ہوئی لڑکیوں کو بھی دکھا دیا کہ "دیکھو مجھے استانی جی نے صدری دی ہے"

بارہ بجے کے بعد استانی جی نے سیپارے بند کرنے کا حکم دیا۔ لڑکیاں جلدی سے جا سیپارے رکھ آئیں، جن کے گھر قریب تھے وہ استانی جی سے پوچھ اپنے گھر کھانا کھانے چلی گئیں۔ کچھ لڑکیوں کے گھر سے ان کے لئے کھانا آگیا اور وہ لڑکیاں جو بہت غریب تھیں، استانی جی کے کھانے میں حصہ دار ہوئیں۔ کھانے سے فراغت ہوئی تو اُستانی جی آرام کرنے لیٹ گئیں اور لڑکیاں کھیلنے لگیں۔ اگر کسی دن اُستانی جی کے نواسہ نواسی آگئے تو انہیں ہی کھلونا بنالیا۔ دو گھنٹے بعد استانی جی بیدار ہوئیں۔ خود نماز پڑھی، لڑکیوں کو پڑھوائی اور حکم دیا کہ گڑیاں نکالو۔ لڑکیوں نے بڑے شوق سے گڑیاں نکالیں اور ان کے کپڑے سینے شروع کر دیئے۔ استانی جی نے کسی کو کلا بنانا سکھایا کسی کو کلیاں کترنی سکھائیں کسی کو بخیہ کرنا اور کسی کو سوئی پکڑنی۔ عصر کے وقت اُستانی جی لڑکیوں سے یہ کہہ کر کہ نماز پڑھ کر آموختہ پڑھ لینا، نماز میں

مشغول ہوگئیں اور اس کے بعد عینک لگا، قرآن شریف کی تلاوت شروع کردی مغرب سے ذرا پہلے قرآن پڑھ کر فارغ ہوئیں۔ لڑکیاں بے صبری سے چھٹی کا انتظار کر رہی تھیں۔ استانی جی نے اٹھتے ہی چھٹی کا حکم دیا اور سب لڑکیاں ہم آواز ہوکر اُستانی جی آداب، اُستانی جی آداب کے نعرے لگاتی اپنے گھروں کو سدھاریں

میں نے جو مکتب کی یہ مختصر سی تصویر آپ کو دکھائی ہے اس میں بہت ممکن ہے کہ آج کل کے ماہرین تعلیم کو خرابیاں نظر آئیں لیکن میں یہی کہوں گی کہ یہ تعلیم پوری تعلیم تھی جس میں ضرورت کے موافق پڑھنا لکھنا، گھر گرہستی کا سلیقہ، اخلاق، آداب، مذہب سب ہی چیزوں کی تربیت شامل تھی اور جو چیز تعلیم کی جان ہے یعنی خلوص، شفقت اور محبت وہ اس مکتب میں نظر آتی تھی۔ آج کل بھی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہی سمجھا جاتا ہے کہ ایک ذات کا اثر دوسری ذات پر پڑے مگر آج کل کی تعلیم یہ مقصد پورا نہیں کرتی۔ اب عام طور پر لڑکیاں یا تو اپنی استانیوں کو بھول جاتی ہیں یا ان کا ذکر کر کے ان کی ہنسی اڑاتی ہیں۔ مگر ان استانی جی کی شاگردیں اب پوتوں نواسوں والیاں ہوکر بھی اپنی اُستانی کو عزت اور محبت کے ساتھ یاد کرتی ہیں، اُن کے ذکر پر ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور وہ کہا کرتی ہیں کہ اب ایسی بیویاں کہاں پیدا ہوتی ہیں۔

(شادی کے بعد)

شادی کے بعد ہندوستانی عورت کی زندگی کا ایک بالکل نیا اور بے جانا بوجھا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اکثر اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ جس شخص سے آئے عمر بھر نباہ کرنا ہے وہ کس شکل وصورت اور کیسے بھاؤ کا ہے اور اس کا خاندان کن خیالات کا ہے۔ خاندان کی وجہ سے اس کی ذمہ داریاں اور مشکلیں اور بڑھ جاتی ہیں۔

ہندوستانی نئے تعلیم یافتہ جوڑے کچھ یورپ کی ریس میں اور کچھ خانگی لڑائیوں جھگڑوں سے تنگ آکر یہ چاہنے لگے ہیں کہ شادی کے بعد اپنا الگ گھر بنائیں اور خاندان والوں سے بہت کم تعلق رکھیں۔ لیکن ہندوستانی خاندانوں میں یہ طریقہ چلنا بہت مشکل ہے۔

ہندوستانی صدیوں سے اس طریقے کے عادی ہیں کہ خاندان کے خاندان مل کر رہیں اور اگرچہ اس رواج کی وجہ سے بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہوگئی ہیں مگر کم سے کم ایک خوبی بھی ضرور ہے اور وہ یہ ہے کہ عام طور پر ہم لوگ ایک دوسرے سے بہت محبت رکھتے ہیں۔ ایک محبت قدرتی ہوتی ہے اور ایک پاس رہنے سہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ دونوں باتیں جمع ہوں گی تو محبت زیادہ بڑھے گی۔ اور ہندوستانی بیوی اور ماں بہن کی محبت تو دنیا میں مشہور ہے۔ ان میں سے

کوئی بھی یہ گوارا نہیں کرسکتی کہ اس کا چہیتا اس سے الگ رہے یا اس سے کم تعلق رکھے۔ یہ بھی ضروری بات ہے کہ اگر نئی بیوی آکر یہ کوشش کرے گی کہ اس کا شوہر اُس کے ساتھ الگ رہے اور اپنے کنبے والوں سے کم ملے تو یہ بات ناگوار ہوگی اور لڑائی کی ابتداء ہو جائے گی۔ سب سے بڑی مشکل ہماری معاشرت میں یہ ہے کہ ایک کمانے والا ہوتا ہے اور دس پندرہ کھانے والے۔ گھر میں ایک ہی کمانے کے قابل مرد ہے، بوڑھی ماں، بیوہ بھاوج، یتیم بھتیجا بھتیجی، کنواری بہن اور چھوٹا بھائی سب کا خرچ اُسے برداشت کرنا ہے اور ان کی سرپرستی اور حفاظت بھی اسی کے ذمے ہے۔ اب بتائیے کہ اگر بیوی یہ چاہے کہ میں الگ گھر میں رہوں اور شوہر کی کُل آمدنی کی مالک بنوں تو یہ کس طرح ممکن ہے۔ شوہر کس کو چھوڑے؟ کس کا کہنا مانے؟

لڑکی کو چاہیئے کہ شادی کے بعد وہ سب سے پہلے اپنے شوہر کی طرف متوجہ ہو۔ شروع میں جب وہ نئی دلہن ہوتی ہے اس وقت گھر کے جھگڑے بکھیڑوں اور سسرال والوں کے طعنوں تشنوں سے بچی رہتی ہے۔ اور یہی وہ وقت ہے جب اُسے سکون کے ساتھ اپنے شوہر کو سمجھنے کا موقع مل سکتا ہے۔ وہ اس فرصت کو غنیمت سمجھے اور اپنے شوہر کے مزاج کو پرکھے، اس کے خیالات، اس کی دلچسپیوں اور کاموں کے متعلق دریافت کرے اور ان میں دلچسپی ظاہر کرے اس سے سسرال والوں کے طور طریق اور مزاج و عادات کا حال

معلوم کرے۔ اگر شوہر اس سے محبت کرتا ہے تو وہ دنیا کی سب سے خوش نصیب عورت ہے۔ گھر بھر کی مخالفت برداشت کر سکتی ہے مفلسی میں چٹنی روٹی کھا کر بھی خوش ہو سکتی ہے۔ بیماری میں بھی اُسے سکون نصیب ہو سکتا ہے اور مرتے وقت بھی آرام و اطمینان کا سانس لے سکتی ہے۔ نہیں تو ساری دولت اور عزت اس کے لئے خاک ہے۔ لوگ کہیں گے کہ شوہر کی محبت قسمت کی بات ہے اور اختیاری چیز نہیں۔ مگر میں اس بات کو نہیں مانتی۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ (ان لوگوں کو چھوڑ کر جنھیں کسی اور سے محبت ہو اور بالکل خلاف مرضی شادی کر دی گئی ہو) ہر عورت کوشش کر کے شوہر کی محبت حاصل کر سکتی ہے حسن کی خاطر بھی شوہر محبت کر سکتا ہے، مگر جو محبت صرف حسن کی وجہ سے ہو گی وہ یقیناً ناپائدار ہو گی۔ اصل اور سچی محبت ہمیشہ سیرت کی خوبی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اگر عورت میں یہ قابلیت اور صلاحیت ہے کہ وہ شوہر پر اپنا اثر ڈال کر اُسے اپنا بنا سکتی ہے تو کیا کہنا اُسے چاہیئے کہ ہر ممکن کوشش سے شوہر کو اپنا ہم خیال بنائے جب خیالات و عادات میں ہم رنگی ہو گی تو محبت خود بخود پیدا ہو جائیگی لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر مرد ایسا ہو کہ وہ بیوی کا ہم خیال بن جائے اور اس کی پسند کو اپنی پسند سمجھے یا قدرتی طور پر دونوں کے عادات اور خیالات یکساں ہوں، اگر ایسا ہو تو سبحان اللہ۔ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے۔ مگر ایسا ہوتا بہت کم ہے۔ جب اوپر والی دونوں باتیں ناممکن

ہوں نہ شوہر اور بیوی قدرتی طور پر یکساں طبیعت کے ہوں اور نہ شوہر بیوی کا ہم خیال بن سکتا ہے، تو عورت کا فرض ہے کہ وہ خود اس کی ہم خیال بن جائے۔ میں جانتی ہوں کہ اپنی عادتوں کو چھوڑنا اور اپنے خیالات بدلنا مشکل کام ہے مگر ناممکن ہرگز نہیں۔ ایک مثل ہے "یا کسی کو اپنا کرلے یا کسی کا ہو رہے"۔ اگر دوسرے پر بس نہیں تو اپنے پر تو ہے۔ بے شک اپنے جائز حقوق اور جائز آزادی حاصل کرنے کی کوشش بھی عورت پر فرض ہے مگر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر شوہر سے لڑا جائے، جس بات کو آسانی سے ہنسی میں ٹالا جا سکتا ہے اُسے بڑھا کر جھگڑا مول لے لیا جائے میں یہ نہیں کہتی کہ سب عورتیں ایسا کرتی ہیں، مگر اکثر جگہ میں نے یہی دیکھا ہے کہ مخالفت کی اصلی وجہ کوئی بہت معمولی سی بات ہوتی ہے میں نہیں سمجھتی کہ کوئی شخص بھی ضدی اور بدمزاج بیوی سے خوش رہتا ہو۔ بدمزاج اور زبان دراز عورت میں اگر ہزار خوبیاں بھی موجود ہوں تو اس کی بدمزاجی اور زبان درازی یا ضد ان سب پر خاک ڈال دیتی ہے اور وہ کبھی خوشی اور آرام اور سکون کی زندگی نہیں بسر کر سکتی۔ اپنی پرانی عادت چھوڑنی بہت مشکل ہوتی ہے لیکن اگر عورت سمجھ دار ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اس کی زندگی ہنسی خوشی بسر ہو تو اس کو اپنے اوپر قابو حاصل کرنا چاہیئے سسرال میں قدم رکھتے ہی بدمزاجی، ضد، زبان درازی کو چھوڑ دے، ماں باپ

کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ وہ اپنی اولاد کو خود ہی بگاڑتے ہیں اور وہی اس کی باتیں برداشت بھی کر سکتے ہیں۔ مگر غیر آدمیوں کو کیا غرض کہ وہ اس کی جا بیجا باتیں برداشت اور درگذر کریں۔ یہ بھی ہمیں خوب معلوم ہے کہ کوئی ہندوستانی عورت اپنے شوہر سے الگ ہو کر خوش نہیں رہ سکتی۔ کچھ اپنی فطری محبت کی وجہ سے اور کچھ سماج کی خرابیوں کے باعث۔ پھر کیوں وہ ایسی کوشش نہ کرے کہ اپنے شوہر اور روا سطے والوں کو راضی رکھے اور ہنسی خوشی زندگی گزارے۔

سمجھ دار عورت کو یہ بھی لازم ہے کہ وہ شوہر کے کام کو بھی سمجھے اور اگر اُس میں کچھ مدد نہیں دے سکتی تو کم سے کم دلچسپی ہی لے سکے اور اس کے متعلق صلاح مشورہ دے سکے۔ اُسے شوہر کی دلچسپیوں میں بھی ضرور حصّہ لینا چاہئے۔ اگر اُسے کتب بینی کا شوق ہے تو خود بھی کتابیں پڑھے اور ان کے بارے میں بات چیت کرے، اگر وہ تاش، ٹینس، سینما وغیرہ کا شوق رکھتا ہے تو ایک حد تک اُس کے ساتھ خود بھی شریک ہو ورنہ کم از کم اس کے شوق میں رکاوٹ ہرگز نہ ڈالے۔

عورت کا فرض صرف اپنے شوہر ہی کو خوش رکھ کر ختم نہیں ہو جاتا اس کا ایک بڑا اور بہت کٹھن فرض اپنے سسرال والوں کی خوشنودی حاصل کرنا اور ان کا دل موہنا ہے، اور یہ فرض سب سے زیادہ صبر آزما ہے۔ کتنی شرم کی بات ہے کہ ہمارے ہاں

ساس بہو، نند بھاوج، دیورانی جیٹھانی کی دشمنی کہاوت بن گئی ہے
یقیناً اس میں سسرال والوں کا بھی بہت کچھ قصور ہے، لیکن بہو بھی
قصور سے بری نہیں۔ آج کل یہ خیال عام ہوتا جاتا ہے کہ ساس نند
ہمیشہ ظالم اور سنگ دل ہوتی ہیں اور بہو مظلوم، بے زبان ہوتی ہے
اور مصیبتیں اٹھاتی ہے۔ میں یہ ہرگز نہیں مانتی۔ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں
سے بجتی ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ بیوی یہ چاہے کہ میرا شوہر میرے
عزیزوں رشتہ داروں سے تو محبت کرے اور اپنے کنبے والوں
سے قطع تعلق کرلے۔ اگر بیوی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ میرا میاں
میرے عزیزوں سے محبت کرے وہاں شوہر بھی تو یہ چاہتا ہے
کہ بیوی بھی اسی طرح میرے عزیزوں کو اپنا سمجھے۔ اکثر جگہ میاں بیوی
کی نااتفاقی کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ مرد اپنی کمائی کا کچھ حصہ اپنے
ماں باپ، کسی بہن یا بھائی یا کسی اور مستحق عزیز پر خرچ کرتا ہے
کیسی شرم کی بات ہے کہ ماں باپ تنگی میں ہوں اور بیٹا ان کو خرچ
نہ دے یا اپنے اور کسی عزیز کو جو زمانے کی گردش میں مبتلا ہے، مدد
نہ کرے۔ مقدور ہونے پر بھی اپنے عزیز کی مدد نہ کرنا بہت شرم کی
بات ہے اور بیوی کا شوہر سے اس قسم کی بات پر جھگڑنا خصوصاً
جب کہ وہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے، کتنی بری اور شرمناک بات ہے!
عورت تو مرد سے زیادہ حساس ہوتی ہے، اور نرم دل رکھتی ہے۔
اسے یاد رکھنا چاہئے کہ جو لوگ دوسروں کی مصیبت میں کام نہیں

آتے تو خدا بھی مصیبت میں ان کی مدد نہیں کرتا۔

بعض جگہ لڑائی کا سبب صرف یہ ہوتا ہے کہ شوہر اگرچہ اپنی بیوی سے بھی محبت کرتا ہے مگر ساتھ ہی اپنے اور عزیزوں مثلاً ماں بہن وغیرہ سے بھی اُسے بہت محبت ہے۔ محبت نام ہے اُس بے لاگ چاہت کا جو کسی صلے کی خواہش اور بدلے کے خیال سے نہ کی جائے محبت کرنے والے کا فرض تو یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کی ہر خوشی پوری کرے۔ نہ یہ کہ اگر محبوب اپنی ماں بہن سے بھی محبت کرے تو بیوی لڑ پڑے اور رشک کرے۔ میں مانتی ہوں کہ رشک پیدا ہونا ایک فطری چیز ہے، مگر ساتھ ہی یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ فطری خوبی نہیں بلکہ فطری کمزوری ہے اور کوشش کر کے اپنے اس عیب کو چھوڑنا اور کمزوری پر غالب آنا چاہیئے۔ شوہر جس سے محبت کرتا ہے اُس سے خود بھی محبت کرے۔ اس سے شوہر کی محبت بیوی کے ساتھ اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ عالی حوصلہ بیویاں تو شوہر کی کسی ایسی عورت کی محبت کو بھی، جو واقعی ان کی حریف ہوتی ہیں، خوشی سے برداشت کر لیتی ہیں، نہ کہ ماں باپ بہن بھائی کی محبت جو خدا کی طرف سے ہوتی ہے اور جس سے زیادہ بے لاگ اور پاک محبت دنیا میں بہت کم دیکھنے میں آسکتی ہے۔

اس کے علاوہ بیوی کا اہم فرض اپنے شوہر کی کمائی کا مناسب استعمال ہے۔ اکثر ناعاقبت اندیش عورتیں اپنے شوہر کے روپیے

کو بڑی بے دردی سے خرچ کرتی ہیں خواہ اپنی فضول خرچی کی عادت کی وجہ سے کریں خواہ اس ضد میں کہ چونکہ شوہر اپنی دلچسپیوں اور اپنے عزیزوں پر خرچ کرتا ہے اس لئے ہم بھی بدلہ نکالیں۔ اور بے موقع بے موقع روپیہ اڑائیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ شوہر کماتا ہے اور روپیہ اس کی ملکیت ہے اور اگرچہ بیوی اس میں حصہ دار ہے مگر بہرحال ہے تو شوہر کا۔ اُسے حق ہے کہ وہ جیسے چاہے خرچ کرے (اسی طرح بیوی کو بھی اپنے ذاتی روپئے پر خواہ وہ اس کی کمائی کا ہو یا جائداد کا پورا حق حاصل ہے) ہاں اگر وہ فضول کاموں اور عیش و عشرت میں روپیہ اُڑاتا ہے تو اس کو روکنے کا بیوی کو یقیناً حق ہے اور اُسے کوشش کرنی چاہئے کہ وہ ان باتوں کو چھوڑ دے۔ اگر شوہر کی آمدنی کم ہے اور بیوی کو خرچ کی تنگی رہتی ہے تب بھی اسے لازم ہے کہ میاں کو پریشان نہ کرے۔ جو کچھ خدا نے دیا ہے اس پر قناعت کرے اور سلیقے سگھڑاپے سے خرچ کرے اور اگر کسی مناسب طریقے سے خود بھی کچھ روپیہ پیدا کرسکتی ہے تو اس طرح شوہر کا ہاتھ بٹائے اور اس کا بوجھ ہلکا کرے۔

مختصر یہ کہ ہر عورت کو اچھی طرح یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ اُسے نئی زندگی میں محض پھل پھولوں سے لدا ہوا باغ ہی سیر کے لئے نہیں ملے گا بلکہ اُسے اس باغ میں کانٹے بھی نظر آئیں گے۔ اس باغ کی سیر اور حفاظت بھی کرنی ہوگی۔ اس کے لئے سخت

محنت اور خونِ دل جلانے کی بھی ضرورت پڑے گی تب ہی وہ اس کی سیر سے لطف اندوز ہو سکے گی۔

ان سب باتوں کے علاوہ عورت کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ صرف بیوی اور ماں ہی نہیں بلکہ سماج کی ایک رکن بھی ہے۔ اگرچہ بیوی اور ماں کے فرائض اس کے سب سے بڑے اور اہم فرائض ہیں۔ مگر ان کے علاوہ اس پر کچھ اپنے ملک و قوم کا بھی حق ہے اور اس کو لازم ہے کہ اپنی حالت کے لحاظ سے جتنی بھی وہ اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے سماج کی خدمت کر سکتی ہے، ضرور کرے چاہے قلم سے چاہے ہاتھ پاؤں سے چاہے صرف زبان ہی سے

تیمارداری

یورپ کے ملکوں میں تیمارداری خاص عورتوں کا فن سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہندوستان کی عورتیں اس فن میں قریب کوری ہیں۔ جب کوئی بیمار ہوتا ہے تو اگرچہ ان کا دل بہت دکھتا ہے اور وہ اس کے لئے اپنا چین آرام سب تج دیتی ہیں لیکن اپنے پر تکلیف اٹھانے سے بیمار کو آرام نہیں پہنچا سکتیں، اور جب اچھی تیمارداری کی ضرورت ہوتی ہے تو مجبوراً اُسے اسپتال میں داخل کرنا پڑتا ہے۔ اب بعض عورتوں نے پرائیویٹ نرسنگ کا کام شروع تو کر دیا ہے لیکن وہ زیادہ تر یا تو انگلو انڈین ہوتی ہیں یا کرسچین کہیں کہیں ہندو مسلمان خواتین بھی یہ کام سیکھنے لگی ہیں۔ مگر نرسوں کو گھر پر بلا کر رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں کیونکہ ابھی نرسیں کم ہیں اور ان کی روزانہ فیس بہت زیادہ۔ غریب آدمی تو انھیں بلا ہی نہیں سکتا اور اوسط درجے والے بھی بہت سخت مجبوری کی حالت میں ان کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بس محض امیروں کو ان سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اگر سستی نرسیں ملتی بھی ہیں تو ان کو اچھی طرح تیمارداری اور مرہم پٹی نہیں آتی لیکن مزاج ہوتے ہیں ساتویں آسمان پہ۔

میں پچھلے کئی سال سخت بیمار رہی تھی اور اس عرصے میں مجھے مختلف قسم کی نرسوں سے سابقہ پڑا جس سے اندازہ ہوا کہ ایک نرس کے لئے کن کن صفات کی ضرورت ہے۔

تیمار داری میں ایک تو استقلال کا ہونا بڑا ضروری ہے۔ بیمار کے پاس ہر وقت بیٹھنا، منٹ منٹ پر اس کا کام کرنا، اس کی بدمزاجی اور چڑچڑے پن کو صبر سے برداشت کرنا بڑا ہی مشکل کام ہے جس کے لئے مستقل مزاجی اور ضبط کی اشد ضرورت ہے۔ دوسری چیز ارادے کی مضبوطی ہے۔ مریض سے وہی کرانا جس کی ہدایت ڈاکٹر نے کی ہے سب سے اہم فرض ہے۔ مریض کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے وہ بات بات پر جھلاتا ہے، روتا چیختا ہے۔ تیمار دار کا کہنا نہیں مانتا لیکن ایک اچھے تیمار دار کا فرض یہ ہے کہ وہ وہی کرے جو اسے کرنا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بیمار کو ڈانٹے یا سختی سے پیش آئے۔ یہ تو نہایت ہی غلط اصول ہے۔ اکثر نرسیں اور تیمار دار یہ بات نہیں سمجھتے کہ مریض کے جہاں سب اعضا کمزور ہو جاتے ہیں وہاں طبیعت میں بھی قوت باقی نہیں رہتی۔ اس کے اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے اسے اپنے مزاج پر قابو نہیں ہوتا۔ جو اس کے دل میں آتا ہے کہتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہر کام اس کی مرضی کے مطابق ہو۔ ناسمجھ تیمار دار اس کی باتوں پر غصہ کرتا ہے اور اس کو ڈانٹتا ہے جس سے مریض کو سخت روحانی تکلیف ہوتی ہے، چونکہ وہ بے بس

اور دوسروں کا محتاج ہوتا ہے اس لئے اُسے چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بہت محسوس ہوتی ہیں، جس طرح ناسمجھ اُستاد بچے اور بڑے کے مزاج کے فرق کو نہیں سمجھتا اور ناسمجھی کی وجہ سے بچے کو ٹھیک تعلیم نہیں دے سکتا، اسی طرح وہ تیمار دار جو مریض کے مزاج کی کمزوری کا خیال نہ رکھے، اچھی تیمار داری نہیں کر سکتا۔ یہ بات غلط ہے کہ جب تک مریض کو ڈانٹا نہ جائے وہ کام نہیں کرنے دیتا۔ ایک دفعہ مریض کے دل میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ خواہ وہ کچھ بھی کرے ہوگا وہی جو ڈاکٹر کی ہدایت ہے تو مریض بہرحال اُسے برداشت کر ہی لیتا ہے خواہ خاموشی سے کرے، خواہ شور وغل مچا کر۔

تیسری چیز دل کی مضبوطی ہے۔ جو لوگ کمزور طبیعت کے ہوں اور مریض کی تکلیف دیکھ کر ضبط نہ کر سکیں اور خود گھبرا جائیں انھیں مریض کے پاس ہرگز نہ رہنا چاہیے۔ مریض اگر تیمار دار کو اپنی تکلیف سے رنجیدہ اور پریشان دیکھے گا تو ایک تو اُسے یہ خیال ہوگا کہ میری حالت بہت خراب ہے، دوسرے اس پر تیمار دار کی بات کا اثر نہیں ہوگا اور وہ اس کا کہنا نہیں مانے گا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میرے شور وغل اور تکلیف کے اظہار سے یہ متاثر ہوتا ہے۔

ایک اور ضروری بات تیمار دار کا خوش مزاج ہونا ہے۔ خوش مزاج اور ہنس مکھ تیمار دار سے مریض بہت خوش رہتا ہے اور اس کے اشاروں پر چلتا ہے۔ شیریں زبانی اور خوش مزاجی عجب چیز ہے

تیمار دار کو لازم ہے کہ اس طرح باتوں میں لگا کر مریض کا کام کر دے کہ اس کو تکلیف کا احساس نہ ہو یا ہو تو بہت کم۔

سلیقہ اور صفائی بھی بہت لازمی بات ہے۔ مریض کے لئے صفائی سب سے ضروری چیز ہے۔ مریض کا لباس، بستر، بدن، کمرہ اور سب سامان ایسا صاف و ستھرا ہونا چاہئے کہ ذرا بھی میل یا گرد نہ ہو اس کا کمرہ اس طرح سجایا جائے کہ دیکھ کر دل خوش ہو۔ سامان کم ہو اور ہر چیز قرینے سے رکھی ہو اور مقررہ جگہ پر، تاکہ ضرورت کے وقت آسانی سے مل سکے۔ مریض کا بستر بدلنا، کروٹ دلوانا، اٹھا کر بٹھانا، منھ دھلانا اسپنج کرنا۔ ان سب میں سلیقے اور احتیاط کی سخت ضرورت ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے مریض کو بہت تکلیف اور کوفت اٹھانی پڑتی ہے

تیمار داری کا فن ایسا ہے کہ اس میں کمال تو صرف وہی حاصل کر سکتے ہیں جن کی طبیعت کو اس سے خاص مناسبت ہو جن میں ہمدردی بھی ہو اور استقلال بھی، صفائی بھی اور سلیقہ بھی، اور خدمتِ خلق کا شوق بھی۔ مریضوں کا مزاج بھی پہچان سکیں اور ارادے کے مضبوط بھی ہوں۔ جب ایسی طبیعت والے تیمار داری سیکھ لیتے ہیں تو بے مثل تیمار دار ثابت ہوتے ہیں۔ اس قسم کی نرس کسی مریض کو مل جائے تو یہ اس کی بڑی خوش نصیبی ہے۔ کیونکہ بیماری میں علاج سے زیادہ عمدہ تیمار داری سے فائدہ ہوتا ہے۔

مجھے دو قسم کی نرسوں کا تجربہ خاص طور پر ہوا ہے۔ کہنے تو ان کا

تھوڑا سا حال سناؤں۔

میں سخت بیمار تھی۔ بیماری ایسی کہ نرس کے بغیر گزارا ناممکن۔ علی گڈھ میں صرف ایک اچھی نرس تھی جو دن کو کام کرتی تھی، رات کی نرس کی بڑی ضرورت اور تلاش تھی۔ بہت جستجو سے ایک نرس ملی۔ کچھ دن تو ایسی حالت رہی کہ تمام گھر ساری رات جاگتا تھا، اس لئے اس کے جوہر نہیں کھُلے۔ جب حالت ذرا سنبھلی اور میں بات چیت بھی کرنے لگی تو گھر والے بھی کچھ دیر کو سونے لگے۔ اب نرس صاحبہ کی یہ حالت کہ آرام کُرسی پر دراز ہو کر جو سوتیں تو سینکڑوں آوازوں سے بھی نہیں اُٹھتی تھیں۔ دوسری عورت جو کمرے میں موجود ہوتی تھی وہ جھنجھوڑتی تب یہ خدا کی بندی اُٹھتی ایک رات کا ذکر ہے کہ میری آنکھ کھُلی۔ پیاس سے سخت بے چین تھی اسی دن ڈاکٹر نے پانی پینے کی اجازت دی تھی۔ اب نرس کو پکارے جاتی ہوں مگر نرس بڑے مزے سے خرّاٹے لے رہی ہے، بہ مشکل سینکڑوں آوازوں بلکہ دوسری عورت کے اٹھانے سے نرس صاحبہ بیدار ہوئیں، اب میں کہتی ہوں کہ پیاس لگی ہے پانی پلاؤ اور وہ دیتی نہیں۔ لاکھ کہتی ہوں کہ ڈاکٹر نے اجازت دیدی ہے، دوسری عورت بھی کہہ رہی ہے کہ ڈاکٹر نے کہدیا ہے، پانی دے دو۔ مگر وہ اللہ کی بندی یہی کہتی رہی کہ ہم نہیں دیں گے ہم سے نہیں کہا۔ مجبوراً انسان کو غصّہ بھی جلد آتا ہے اگرچہ خود اسی کو نقصان

اٹھانا پڑتا ہے کہاں تو مجھے ہلنا مشکل تھا اور کہاں غصہ میں ہاتھ بڑھا کر میز کو جس پر "ہیٹر" (کمرہ گرم کرنے کا آلہ) اور پانی کا گلاس رکھا تھا گھسیٹ لیا۔ ہیٹر نیچے گر گیا بس ذرا سی کسر تھی ورنہ میرے اوپر ہی گرتا جھنجھلاہٹ اور کمزوری کی وجہ سے میری طبیعت بگڑ گئی اور غش آگیا۔ صبح کو ڈاکٹر نے حالت دیکھی تو بہت خفا ہوئی اور ڈانٹ ڈپٹ کر نرس کو الگ کر دیا اس کے بعد ایک نرس دہلی سے بلائی گئی۔ پہلی ہی رات کو انجکشن لگانے کی ضرورت ہوئی مگر وہ ایسی نرم دل نکلیں کہ انھوں نے انجکشن لگانے سے انکار کر دیا۔ اگلے دن ان کو بھی رخصت کیا گیا اور آگرے سے نرس بلائی گئی۔ یہ بڑی اچھی اور قابل نرس تھی۔ رات کے آٹھ بجے سے صبح کے آٹھ بجے تک خواہ میں سوتی ہوں یا جاگتی یہ پورے وقت میرے پاس کھڑی رہتی تھی اور ہر کام ایسی محبت، آہستگی اور سلیقے سے کرتی تھی کہ آج تک میرے دل میں اس کی یاد باقی ہے۔

کچھ عرصے بعد دہلی آکر میرا آپریشن ہوا۔ ایک نرس آپریشن سے پہلے تشریف لائیں تو ایسے کڑوے مزاج اور سخت لہجے سے پیش آئیں کہ میں اور سب گھر والے حیران رہ گئے۔ آپریشن کے بعد جب مجھے واپس لائے تو اس وقت بھی سب گھر والوں سے خوب لڑی، اس پر بھی سب خاموش رہے۔ شام کو مارفیا کا انجکشن دینے آئی۔ میں نیم بے ہوش تھی اسی حالت میں انجکشن لگوانے سے انکار کیا تو مجھے بہت ڈانٹا، اب تو میں غصے سے بے تاب ہو گئی۔ خوب

اُسے ڈانٹا کہ تمھیں نرس کس نے بنایا ہے کہ تم اتنا بھی نہیں جانتیں کہ مریض سے کیسے پیش آنا چاہئے۔ بس اب میرے پاس مت آنا چلی جاؤ

یہ عورت دراصل ایک اور نرس کی غیر موجودگی میں عارضی طور پر آئی ہوئی تھی۔ اُسی دن وہ نرس واپس آگئی۔ میں بہت ڈری ہوئی تھی کہ خدا جانے یہ کس مزاج کی ہوں گی مگر وہ ایسی خوبیوں کی نکلیں کہ جیسے ان سے سابقہ پڑ گیا ساری عمر ان کے احسان نہیں بھول سکتا اس محبت اور ہمدردی سے تیمارداری کرتی ہیں کہ بیمار ان کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ ہر مریض کی زبان پر یہی ہے کہ ہم تو بائی جی سے ڈریسنگ اور کام کرائیں گے۔ زخموں کی ڈریسنگ کرنا جیسا کٹھن کام ہے وہ کرنے اور کرانے والے کا دل ہی جانتا ہے مگر سخت سے سخت اور نازک سے نازک زخم کی ڈریسنگ بائی جی کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ کریں گی وہی جو انھیں کرنا، مگر ایسا دلاسا دیں گی، ایسی طرح باتوں میں لگائیں گی کہ مریض کچھ کہہ ہی نہیں سکتا اور بعد میں تکلیف دینے کی معذرت بھی کرلیں گی۔ اسپنج کرنا۔ منہ دھلانا، کپڑے بدلنا، غرض کونسا کام ہے جو وہ بہترین طریقے سے نہ کرتی ہوں اور پھر ہر مریض یہ سمجھتا ہے کہ بائی جی کو سب سے زیادہ مجھ ہی سے محبت ہے۔ صبح سے شام تک بیسیوں وارڈوں کا کام کرتی ہیں، مگر کبھی تیوری پر بل نہیں۔ کام کی زیادتی کی شکایت نہیں، تکان کا ذکر نہیں۔ برسوں مجھے ان سے سابقہ رہا مگر ایک دن بھی ایسا نہیں ہوا کہ

ان کی طرف سے کسی قسم کی شکایت پیدا ہوتی۔ نہ صرف میں بلکہ ان کا ہر مریض، ہر مریض کے رشتہ دار ان کی خدمت، محبت، ان تھک محنت اور دل سوزی کے قائل اور معترف رہتے ہیں، میرا خیال ہے کہ ان سے بہتر تیمار دار ہونا اگر نا ممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان کی شریف عورتیں تیمارداری کا کام سیکھ لیں تو بیمار کے لئے خدا کی رحمت ثابت ہوں گی اور ہمارے گھروں میں بیماری کی وجہ سے جو رنج و مصیبت کی فضا چھائی رہتی ہے وہ بہت کچھ بدل جائے گی۔

ہَماری عیدُ

عید کیا ہے اور کیوں منائی جاتی ہے؟ آئیے اس کے متعلق آپ کو کچھ بتاؤں۔ یہ تو آپ جانتی ہیں کہ تہوار ہر مذہب و ملت، اور ہر قوم میں منائے جاتے ہیں اور کثرت سے منائے جاتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ خوشی منانے کے بہانے ڈھونڈا کرتا ہے اور موقع ملتے ہی جشن منانے لگتا ہے۔ تہوار میں چونکہ ساری قوم مل کر خوشی مناتی ہے اس لئے اس کی اہمیت اور خوشی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

تہوار کئی قسم کے ہوتے ہیں بعض موسم کے لحاظ سے منائے جاتے ہیں، بعض کسی خاص تاریخی واقعے کی یادگار کے طور پر بعض مذہبی تہوار ہوتے ہیں اور بعض کسی فرض کی ادائگی کی خوشی میں منائے جاتے ہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ انسان کو سب سے زیادہ دلی اور روحانی خوشی اپنا فرض ادا کرنے کے بعد ہوتی ہے اور جو تہوار مذہبی فرض ادا کرنے کے بعد منایا جائے اس کی مسرت کا کیا کہنا وہ تو دنیا کی سب سے بڑی خوشی معلوم ہوتی ہے۔

یوں تو مسلمانوں میں بھی چھوٹے موٹے بہت سے تہوار منائے جاتے ہیں مگر ایسے تہوار جو دنیا بھر کے کروڑوں مسلمان

ایک دن ایک ساتھ، ایک طریقے سے مناتے ہیں صرف دو ہیں۔ ایک عید الفطر اور دوسرا عید الضحیٰ جنھیں عوام میٹھی عید اور سلونی عید بھی کہتے ہیں۔ یہ دونوں تہوار مذہبی حیثیت رکھتے ہیں اور بہت بڑے اور اہم فرائض کے ادا ہونے کی خوشی میں منائے جاتے ہیں۔ ہم اس وقت آپ سے عید الفطر کے تہوار کا ذکر کریں گے۔

عید الفطر سے پہلے رمضان کا مقدس اور مبارک مہینہ آتا ہے اور اس مہینے میں جو فرض ہر عورت، مرد اور نو دس سال سے زیادہ عمر کے بچے تک کو لگاتار مہینے بھر تک ادا کرنا پڑتا ہے وہ خاصا کٹھن فرض ہے۔ بارہ تیرہ گھنٹے سخت سے سخت گرمی ہو یا کڑاکے کی سردی بالکل بھوکا پیاسا رہنا اور ساتھ ساتھ اپنے دوسرے مذہبی اور سب معاشرتی فرائض بھی ادا کرنا خاصا مشکل کام ہے۔

عام طور پر سب مسلمان رمضان کے مہینے کو بہت مقدس سمجھتے ہیں اور روزے کے علاوہ اور بھی جتنے نیک کام وہ کر سکیں اُس کے کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔

اس مہینے میں مسلمان ہر بُرا کام کرنے سے، ہر بُری بات منھ سے نکالنے سے بچنا چاہتا ہے اور حتی المقدور جس قدر خدمت ہاتھ پاؤں، زبان یا پیسے سے دوسروں کی کر سکتا ہے بخوشی کرتا ہے۔ راتوں کو خدا کی عبادت کرتا ہے، دن میں کلام اللہ کا ورد کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ خدا کے سب احکام بجا لائے، جس نے مہینے

بھرتک یہ ریاضت کی ہو اور خدا کی خوشنودی اور رضامندی کا
خیال رکھا ہو اُسے جسقدر بھی خوشی ہو کم ہے، اس کے بعد وہ اگر جشن
اور خوشی منائے اور خدا کا شکر ادا کرے تو کیا بے جا ہے۔
چنانچہ مہینے بھر کی ریاضت اور عبادت کے بعد شوال کی پہلی
تاریخ کو عید منائی جاتی ہے۔ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق جشن
کرنے کی کوشش کرتا ہے، نیا جوتا خریدتا ہے، نئے کپڑے بناتا
ہے، میٹھی چیزیں پکواتا ہے، بچوں اور نوکروں کو انعام دیتا ہے
اور نماز پڑھنے عید گاہ جاتا ہے۔ یہ نماز سب مسلمان مرد اکٹھے ہوکر
ادائے فرض کی خوشی میں خدا کے شکر کے طور پر ادا کرتے ہیں عورتیں
اس فرض کو گھر ہی پر ادا کرتی ہیں، تمام مسلمان خواہ اس میں صاحب
تخت بادشاہ ہو خواہ محتاج فقیر ایک ہی صف میں پہلو بہ پہلو اپنے
خالق حقیقی کی بارگاہ میں سر بسجود ہو جاتے ہیں۔ سہ

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندۂ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

نماز کے بعد سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے گلے
ملتے ہیں اس وقت دشمنی اور مخالفت کا خیال نہیں کیا جاتا اور اعلیٰ
اور ادنیٰ کا فرق بھی مٹ جاتا ہے۔ اسلام کی مساوات کی تعلیم کا

نچوڑ اس وقت آپ کو نظر آسکتا ہے۔

عورت کو رمضان میں بھی اور عید کے دن بھی مرد سے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ اسے مذہبی فرض کے ساتھ ساتھ گھرداری کے فرائض بھی انجام دینے ہوتے ہیں۔ رمضان میں روز آدھی رات سے اٹھ کر سب گھر والوں کے لئے سحری کا انتظام کرنا ہے رمضان میں رات کے دو تین بجے کے بعد سونا شاید ہی کسی گھر والی کو نصیب ہوتا ہو۔ اتنے کھلا پلا کر سب کاموں سے، فارغ ہوئی کہ صبح کی اذان کی آواز کانوں میں آئی۔ نماز پڑھی قرآن شریف کی تلاوت ختم کی کہ صبح ہو گئی۔ اب بچوں اور ان لوگوں کے لئے جو کسی وجہ سے روزے سے نہیں ہیں، کھانے کی فکر کی اور پھر گھر کے دوسرے دھندوں میں لگ گئی، دوپہر کو مرد اور بچے رات کی نیند کی کمی پوری کرنے اور روزہ بہلانے کے لئے سو جاتے ہیں، مگر اسے کمر لگانا مشکل ہی سے نصیب ہوتا ہے۔ وہ شام کی افطاری اور کھانے کے انتظام میں مشغول ہے۔ ایسا نہ ہو کہ افطار کا وقت آجائے اور کوئی چیز تیار ہونے سے رہ جائے۔ افطار کے وقت سب کو کھلانے پلانے، دینے دلانے میں اسے اپنے روزے کا بھی دھیان نہیں رہتا۔ نمک کی ڈلی یا کھجور کا دانہ تو ضرور منھ میں ڈال لیتی ہے کہ روزہ کھل جائے مگر کچھ کھانا گھنٹے دو گھنٹے بعد ہی نصیب ہوگا سب کو دے دلا کر کھا پی کر فارغ ہوئی۔ نماز پڑھی، سحری

کے لئے چیزیں سنبھال کر رکھیں۔ ہمت پڑی تو تراویح بھی پڑھ لی اور بارہ ایک بجے جا کر پلنگ پر لیٹی تھی کہ منٹوں میں دو ڈھائی تین بج گئے اور وہ سحری کی فکر میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

جوں جوں عید نزدیک آرہی ہے اس کی فکروں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ میاں کے لئے کپڑا جوتا اور ٹوپی سب نئے ہونے چاہئیں باہر کے جانے والے ٹھہرے۔ دوگانہ کو جائیں گے تو کیا نئے کپڑے ہی نہ ہوں؟ بچوں کے لئے نئے کپڑے، نئے جوتے نہ آئے تو جان کھا جائیں گے رو رو کر برا حال کریں گے۔ میرا کیا ہے پہلے کے کپڑے رکھے ہیں وہی پہن لوں گی۔ سویاں ابھی سے منگا کر بھون لوں تو آسانی ہو جائے گی، چاندی کے ورق، کھوپرا اور میوہ بھی آجاتا تو اچھا تھا، شکر کو تو بھول ہی گئی کہیں مہنگی نہ ہو جائے۔ روپے ابھی سے بھنا کر رکھ لینے چاہئیں۔ دودھ کو کہلوا دوں ایسا نہ ہو کہ وقت پر دودھ والا انکار کر دے۔ بڑی لڑکی اور چھوٹی نند کو سیدھا ضرور جانا چاہئے۔ نوج تہوار کے دن خالی ہاتھ جائیں۔ کہاں تک گناؤں ایک جان پر ہزار ہا فکریں سوار رہتی ہیں اور یہ عورت ہی کی ہمت اور طاقت ہے کہ وہ ان سب کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتی اور خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کرتی ہے

لیجئے عید کا چاند دکھائی دے گیا۔ سب لوگ اطمینان سے سونے کی تیاری کر رہے ہیں کہ آج رات سحری کے لئے اٹھنا نہیں

اطمینان سے سوئیں گے۔ مگر گھر والی کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ بھی لیٹ کے
تیس دن کی تکان اتار لے۔ سب کے کپڑے، جوتے، موزے ڈالی
ایک جگہ کر کے رکھے کہ صبح کو ڈھونڈنے نہ پڑیں۔ میوہ بھگو دیا، ہریا
شکر دیگچے، کیوڑا وغیرہ باورچی خانے میں رکھ دیا کہ اندھیرے سے
اٹھ کر پکا سکے۔ فطرہ کا اناج تول کر الگ رکھا، لڑکیوں کے ہاتھ
پاؤں میں مہندی لگائی۔ غرض اسی آٹھ بھیر میں بارہ کا گجر بج گیا۔ ذرا
ہی ذرا آنکھ جھپکی تھی کہ گھنٹے نے چار بجائے اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی
نہانے کے لئے پانی گرم کیا، سویاں چڑھا دیں، گھر میں جلدی جلدی
جھاڑو بہار دی دلائی۔ بچوں کو جو عید کی خوشی میں ماں کے ساتھ
ساتھ اٹھ بیٹھے تھے نہلا دھلا کر کپڑے پہنائے۔ لڑکیوں کو چوڑیاں
اور زیور پہنایا۔ میاں کو زبردستی اٹھا کر نہانے بھیجا۔ سویاں پک
چلی تھیں انھیں پیالوں میں نکالا اوپر سے چھوارے ڈال چاندی
کے ورق لگا دستر خوان پر رکھا اور سب کو کھلایا پلایا۔ ابھی اس کی
فرصت نہیں کہ خود بھی نہا دھو کر کپڑے بدل لے مگر اسی حال میں
کھلی جاتی ہے، نہال نہال ہے۔ بچے سلام کر کے ماں سے
لپٹ رہے ہیں، ماں ممتا سے مجبور ہو کر لپٹا رہی ہے۔ میاں بن
سنور اکڑتے ہوئے کمرے سے نکلے۔ بیوی نے مسکرا کر پان دیا
ذرا سا عطر لگایا۔ دونوں نے بچوں کو عیدی دی، بچے اور زیادہ
اُمنگ رہے ہیں ماں برس کے برس دن انھیں رنجیدہ کیسے کرے

اور پیسے نکال کر دیتی ہے اور اللہ حافظ، اللہ نگہبان کہتی بچوں اور
میاں کو عیدگاہ بھیج دیتی ہے۔ خود ملنے جلنے والوں اور کنبے والوں
میں حصے بخرے بھیجے۔ دوسری جگہ کے آئے ہوئے سنگوائے۔ بھنگی
بہشتی، دھوبی نوکر چاکر سب کو عید کا انعام دیا۔ سویاں اور روٹیاں
دیں۔ خاصدان میں بہت سی گلوریاں رکھ کر باہر دیوان خانے میں
رکھ دیں۔ پھر خود بھی سر گوندھ کر کپڑے بدل لئے، ایسا نہ ہو آیا
گیا دیکھ کر تھوڑی تھوڑی کرے۔ پاس پڑوس کی دس پانچ عورتیں
آگئیں، سب نے مل کر عید کی نماز پڑھی، آپس میں گلے ملیں، عطر الائچی
پان، سویوں وغیرہ سے ایک دوسرے کی خاطر کی اور جلدی سے
اپنے اپنے گھر چلی گئیں کہ مرد نماز پڑھ کر آتے ہوں گے، میاں ابھی
آئے نہیں، ملنے ملانے میں مصروف ہیں اور بیوی ان کے دوستوں
کی خاطر مدارات کر رہی ہیں۔ خدا خدا کر کے میاں عیدگاہ سے واپس
آئے۔ بچوں کے لئے کھلونے کباب اور مٹھائی لے کر آئے ہیں۔ بیوی
نے دسترخوان بچھایا، میاں بچوں اور سب گھر والوں کے ساتھ ہنسی
خوشی کھانا کھایا۔ عزیز رشتے دار ملنے آ گئے۔ سب کی خاطر تواضع کی
کسی کو عیدی دے کر گلے لگایا کسی سے عیدی لے کر سلام کیا۔ شام
کو میاں تو چھڑی لے کر پھر ملنے ملانے نکل گئے اور بیوی کھانے کے
اہتمام میں مشغول ہوئیں۔ عید کی رات ہے کھانا بھی اچھا ہونا چاہیئے
غرض صبح کے چار بجے سے رات کے بارہ ان ہی دھندوں میں بج گئے عید کے

دن نوکر چاکر بھی پورے نہیں تو آدھے دن کی چھٹی ضرور لے لیتے ہیں مگر عورت کا کام روز سے کم نہیں بلکہ اور زیادہ ہو جاتا ہے کیوں نہ ہو، گھر والی ہے، گھر کی ملکہ ہے، گھر کی ننھی سی سلطنت کا انتظام اس کے ذمّے ہے۔ یہ چھٹی منائے تو سلطنت کے کام میں خرابی نہ پیدا ہو جائے۔ وہ اپنے اس کام ہی میں مگن ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ دو دو فرض ادا کر رہی ہے۔ اس نے مذہبی فرض بھی ادا کیا، اور معاشرتی بھی، پھر کیوں نہ اس کو دُہری خوشی ہو۔ اسی لئے مردوں سے زیادہ خوش ہے اُسے سچّی دلی اور روحانی مسرت حاصل ہے جو صرف دوسروں کی خدمت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ عورت کی عید یہی ہے کہ اس کے عزیز پیارے اس کے پاس ہوں عید کے موقع پر لوگ لاکھ جتن کر کے گھر پہنچتے ہیں۔ جو عورت مہینوں سے اس کی آس لگائے ہو کہ اس کا لاڈلا بیٹا، یا چہیتا خاوند، پیارا بھائی یا شفیق باپ عید پر آکر اُس سے ملے گا وہ خوشی سے پھولی نہ سمائے تو کیا تعجب ہے۔

عید چونکہ ادائے فرض کی خوشی میں منائی جاتی ہے اس لئے وہ صرف امیروں ہی کی خوشی کا دن نہیں بلکہ غریبوں کی خوشی کا دن بھی ہے۔ بلکہ ان کی خوشی امیروں سے زیادہ ہے کیونکہ امیر تو آئے دن کسی نہ کسی بہانے جشن منایا ہی کرتے ہیں غریب کو تلاش معاش اور گھر کی فکروں سے اتنی فرصت کہاں کہ روز روز خوشی منا سکے

لیکن عید چونکہ مذہبی تہوار ہے اس لئے وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر اس کا اہتمام کرتا ہے اور یوں بھی امیروں سے زیادہ غریب ہی اپنے اس کٹھن فرض کو انجام بھی دیتے ہیں۔ صاحب حیثیت شخص ہزاروں بہانے بنا کر روزے سے چھوٹ سکتا ہے اور کفارہ دے کر اپنے ضمیر کو بھی خاموش کر دیتا ہے غریب کے پاس روزہ کھول کر کچھ کھانے کو بھی نہ ہو پر وہ روزہ ضرور رکھے گا۔ امیروں نے روزہ رکھا ہے تو سحر اور افطار پر دنیا بھر کی نعمتوں سے اپنے پیٹ کی پوجا کی ہے جس خانہ خراب سے روزہ بہلایا ہے۔ غریبوں نے تو روکھی روٹی، بھیکے چاول اور سادا پانی پی کر روزے رکھے ہیں۔ اور اب جب وہ اپنے فرض سے ادا ہو چکا ہے اس کی خوشی زیادہ گہری، زیادہ سچی اور روحانی خوشی ہے۔ وہ بھی دل کھول کر خوش ہوتا ہے اور اکڑتا پھرتا ہے۔

سب مسلمانوں کا خصوصاً عورت کا کیونکہ وہ زیادہ حساس ہوتی ہے یہ فرض ہے کہ وہ جس طرح اپنے پتنگیں اٹھا کر بھی گھر والوں کی عید کا سامان کرتی ہے اسی طرح اپنے غریب ہمسایوں اور محتاج عزیزوں کو بھی نہ بھولے۔ یہ نہ ہو کہ عید کے دن اس کے بچے قیمتی کپڑے پہن کر اور بہت سے روپے لے کر عید گاہ جائیں اور ہمسائی کے یتیم بچے کے پاس دھلا کرتا اور پرانی جوتی بھی نہ ہو اور وہ حسرت سے اس کے بچوں کو دیکھ کر آنسو بہائے۔ وہ خود زرق برق کپڑوں

اور طلائی زیورات سے اپنے جسم کو آراستہ کرے اور اس کی کوئی غریب بہن یا ہمسائی پھٹا ہوا کرتا اور میلا پیوند کا پاجامہ پہنے ہو، وہ دنیا بھر کی نعمتیں گھر میں پکوائے اور اس کی پڑوسن کے پاس چار پیسے بھی نہ ہوں کہ وہ روکھی روٹی ہی پکا کر میاں بچوں کو کھلا دے یا معصوم بچہ کے ہاتھ پر دو پیسے ہی رکھ دے، ہر حیثیت والی عورت کو چاہیے کہ وہ عید سے پہلے اپنے آس پاس دیکھ لے کہ کس کو کس چیز کی ضرورت ہے اور جہاں تک بھی ہو سکے اپنے ہمسائے اور غریب عزیزوں کی ضروریات پوری کرنے کا انتظام کرے۔

یقین مانئے جو بہن اپنے دوسرے فرائض کے ساتھ ساتھ انسانی ہمدردی بھی کرے گی، حقوق ہمسایہ ادا کرے گی، اپنے مصیبت زدہ جاننے والوں کو یاد رکھے گی ان کی ضروریات پوری کرے گی اس کی خوشی دوہری سے تہری اور چوگنی ہو جائے گی۔ حقیقی اور دلی مسرت صرف اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جس کے آس پاس کے سب لوگ بھی خوش ہوں۔ جس نے دوسروں کا خیال رکھا اور ان کی امداد کی ہے سچی اور اصلی عید صرف اسی کا حصہ ہے، ورنہ باوجود مذہبی فرض ادا کرنے کے اسے حقیقی اور روحانی خوشی حاصل نہیں ہو گی کیونکہ اس کا ضمیر سرزنش کرتا رہے گا۔ مولانا حالی مرحوم فرماتے ہیں ؎

چیست انسانی تپیدن از دل ہمسایگاں ازسموم نجد در باغِ عدن پژمان شدن

انسانیت کیا چیز ہے ؟ یہی کہ آدمی کے دل میں پڑوسیوں کا درد ہو، وہ عدن کے باغ میں بیٹھکر سنجد کی گرم ہوا کی لپٹ محسوس کر سکے۔

بَدمِزاج بیویُ

ناخدایانِ ریڈیو کا اصرار ہے کہ میں بدمزاج ہوی کے متعلق ریڈیو سننے والی بہنوں سے بات چیت کروں۔ اگرچہ اس موضوع کے لئے کوئی بدمزاج بیوی زیادہ موزوں ہوتیں مگر خیر۔ معلوم نہیں اب پروگرام ڈائرکٹر صاحب کو یہ خیال کیوں پیدا ہوا کہ میں اس پر روشنی ڈال سکتی ہوں؟ افسوس ہے مجھے اس بارے میں ذاتی تجربے نہیں کہ جو آپ کو سناؤں۔ مگر خیر آئیے آپ کو ایک بہن کی آپ بیتی سنائے دیتی ہوں۔

میری والدہ کی ایک ہمسائی اور سہیلی تھیں جنھیں میں بچپن سے خالہ کہا کرتی تھی۔ آخری مرتبہ میری ان سے ملاقات ان کے بیٹے کی شادی میں ہوئی تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ ان کی بہو ایسی پیاری صورت کی تھی کہ دیکھ کر بھوک بھاگے اور سنا تھا کہ پڑھی لکھی اور سلیقہ شعار بھی ہے۔ بہو کو دیکھ کر ساس نند میاں دیور سبھی خوش تھے۔ اس شادی کے کچھ دن بعد میں دوسرے شہر چلی گئی اور پھر مدت تک ان لوگوں سے ملاقات نہ ہو سکی۔ سچ پوچھیے تو دس برس کے طویل زمانے نے ان لوگوں کا خیال ہی میرے ذہن سے نکال دیا تھا۔ اب جو میں دوبارہ وطن واپس آئی تو ایک

دن برابر والے مکان سے دو بچے کھیلتے ہوئے میرے گھر میں آگئے ایک سات برس کی لڑکی تھی اور دوسرا تین برس کا لڑکا۔ بچے پیارے پیارے اور صاف ستھرے تھے۔ میں نے انھیں پیار کیا اور پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو تو معلوم ہوا کہ وہ ہماری خالہ ہمسائی کے پوتا پوتی ہیں۔ میں نے ان سے کہا، میں دوپہر کو تمھارے گھر آؤں گی۔ بچے تو چلے گئے اور میں اپنے کام میں لگ گئی۔ دوپہر کو میں نے کھڑکی میں لگے ہوئے دس برس کے زنگ خوردہ قفل کو بہ مشکل کھولا اور اس ارادے میں تھی کہ ماما کو وہاں بھیج کر اپنے آنے کی اطلاع کراؤں کہ پڑوس کے گھر سے کسی عورت کے بکنے جھکنے کی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ آواز سے کان آشنا معلوم ہوئے غور کیا تو یاد آیا کہ خالہ ہمسائی کی لڑکی سلمہ کی آواز ہے جو چلّا چلّا کر کہہ رہی ہیں: "بس بی بس تم مجھ سے زبان نہ چلایا کرو۔ تمھاری بدمزاجی تمھارے صاحب بہادر اٹھائیں گے، مجھے ایک کہو گی تو دس سنو گی۔ ہر وقت بدمزاجی اور زباں درازی، ہر دم منھ پھولا سوجا ہوا۔ اس عورت کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔" دوسری روتی ہوئی آواز میرے کان میں آئی۔ "آپا تم تو جب دیکھو پیچھے پڑی رہتی ہو آخر میں نے کیا کہا تھا جو تم جھاڑ کا کانٹا ہو کر مجھے چمٹ گئیں۔ بچوں کو ماروں ڈانٹوں نہیں، نصیحت نہ کروں تو ان کی عادتیں خراب ہوں گی؟ زندگی تو میرے بچوں کی خراب ہوگی اور تو سب مزے

میں رہیں گے"۔ دوسری نے چلّاکر کہا"بس بس زیادہ نہ اتراؤ۔چلی ہے بڑی بچوں والی، میرے بھائی کی اولاد ہے میں ضرور بولوں گی...... ایسی مائیں دیکھی نہ سنیں جو جلن میں بچّوں کو مار مار کر ادھ موا کر دیں"۔ اس کے بعد زور زور سے دوہتّڑ مارنے کی آواز آئی اور سلمہ کے چلّانے کی"بس خبردار اگر اب ہاتھ اٹھایا تو خدا کی قسم اچھا نہ ہوگا" یہ کہہ کر انھوں نے بچّے کو گود میں اٹھا لیا اور سیدھی کھڑکی کی طرف کو آئیں تو مجھے کھڑا دیکھ کر بولیں"۔ اے ہے بہن تم کب آئیں ہمیں تو پتہ ہی نہ تھا"۔ یہ کہہ کر وہ بچّے کو لے کر میرے ہاں آگئیں اور شام تک بیٹھی رہیں۔ اس عرصے میں ان کی بھاوج کے رونے پیٹنے کی آوازیں آتی رہیں۔ سلمہ جب تک بیٹھی رہیں بھاوج کی بدمزاجی کا گلہ کرتی رہیں ان سے معلوم ہوا کہ ان کی ماں کا دو سال ہوئے انتقال ہوگیا اور ان کے شوہر بھی چار پانچ سال ہوئے فوت ہوگئے اور اب وہ بھائی کے ہاں رہتی ہیں۔ انھوں نے کچھ ایسی مظلومی اور بےکسی سے اپنا حال اور بھاوج کے مظالم اور بدمزاجی کے قصّے سنائے کہ کیا کہوں۔ یہ بھی کہا کہ بھاوج کی بدمزاجی سے میں ہی کیا ہر کس و ناکس پناہ مانگتا ہے۔ خود بھائی صاحب نالاں رہتے ہیں۔ شام ہوتے وہ اپنے گھر چلی گئیں اور معلوم ہوتا تھا کہ شام کو شبیر احمد (خالہ ہمسائی کے لڑکے) کے آنے کے بعد پھر لڑائی ہوئی۔ اس کے بعد اکثر ان کے ہاں سے جھگڑوں قصّوں کی آوازیں آیا کرتی تھیں اس عرصے میں میرا

ان کے ہاں کافی آنا جانا ہو گیا۔ سارہ کی بھاوج جمیلہ پہلے سے بہت دُبلی اور کالی ہو گئی تھیں۔ مزاج میں چڑچڑا پن بھی بہت تھا مگر مجھ سے تو بیچاری ہمیشہ اخلاق اور محبت سے پیش آتی رہیں۔ سب سے زیادہ ان کی لڑائی اپنے میاں سے ہوتی تھی۔ تند اور دلیر۔ جو چاہتیں کہہ دیتیں وہ منھ پھلا کر یا دو ایک جواب دے کر چپ ہو رہتیں مگر میاں بیوی خوب لڑتی تھیں۔ خود شبیر صاحب نے اکثر میرے شوہر سے شکایت کی کہ بھائی میں تو اس زندگی سے عاجز آ گیا ہوں۔ بیوی کی بدمزاجی نے میرا جینا مشکل کر رکھا ہے۔ واقعی ان کے گھر کی حالت بہت افسوسناک تھی۔ ہر وقت جھگڑا بکھیڑا، رونا پیٹنا، ہسٹیریا کے دورے، ایک آفت مچی رہتی تھی۔ ہاں اتنا میں نے اندازہ لگایا کہ سارہ بڑی کائیاں اور گانٹھ ہے۔ بھائی سے چھپ کر بھاوج کو ہزاروں باتیں سناتی ہے اور تانوں تشنوں سے اس کا کلیجہ چھلنی کرتی رہتی ہے اور بھائی کے سامنے مسکین بلی بن جاتی ہے اور کچھ اس تدبیر سے آگ پر تیل چھڑکتی ہے کہ بھائی اُسے مظلوم اور بیوی کو ظالم سمجھتا ہے۔

اس طرح چھ سات مہینے گزر گئے اور جمیلہ سے میری خاصی دوستی ہو گئی بار بار میرا جی چاہتا تھا کہ جمیلہ کو سمجھاؤں کہ کمبخت تم نے اپنی اور اپنے شوہر کی زندگی مصیبت بنا رکھی ہے۔ اپنے مزاج کو قابو میں کر کے اپنی گھر کی حالت سدھارو۔ مگر ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ برا مان جائے گی لیکن سے ملنا چھوڑ دے، پھر بھی میں نے

ارادہ کر لیا کہ کچھ ہو ایک دن اُسے سمجھاؤں گی ضرور۔

ایک دن جمیلہ میرے ہاں بیٹھی تھی اور خلافِ معمول ہنس ہنس کر اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی۔ سلمہ کہیں ملنے گئی ہوئی تھیں اس لئے مجھے ان کے آنے کا خوف بھی نہیں تھا۔ میں نے موقع غنیمت دیکھ کر ذکر چھیڑا "جمیلہ بہن اگر بُرا نہ مانو تو تم سے ایک بات پوچھوں"؟ جمیلہ نے کہا "بہن میں تو سمجھی تھی کہ مجھ میں تم میں اب اتنی بے تکلفی ہو گئی ہے کہ ہم ایک دوسرے کی بات کا بُرا نہیں مان سکتے مگر معلوم ہوتا کہ تم بھی مجھے اوروں کی طرح بدمزاج اور ہر ایک سے خواہ مخواہ لڑنے والی سمجھتی ہو" میں نے اُسے آزردہ دیکھ کر کہا "جمیلہ میرا مطلب تم غلط سمجھیں، میں تمہیں بدمزاج نہیں سمجھتی مگر ہاں اس بات کا تعجب ضرور ہے کہ تم پہلے اس قدر خوش مزاج اور تندرست اور ہنس مکھ تھیں اور اب لوگ تمہیں نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں" جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا "جس کا جو جی چاہے کہے، میری قسمت ہی ایسی ہے۔ مارنے کا ہاتھ پکڑ لے کہنے کی زبان کون پکڑ سکتا ہے" میں نے کہا "ہاں بہن دنیا کے کہنے کی پروا تو نہیں کرنا چاہیے، مگر معاف کرنا تم سے تو تمہارے میاں بھی ناراض رہتے ہیں۔ تم لوگوں کی نااتفاقی اور جھگڑے دیکھ کر مجھے دلی تکلیف ہوتی ہے۔ تم کسی کی پروا نہ کرو مگر خدا کے لئے اپنے شوہر کی ناراضگی کا تو خیال رکھا کرو" جمیلہ ایک دم برس اٹھی "شوہر شوہر سنگدل، ظالم جس کے

کارن میں سنے اپنی یہ حالت کر لی اور وہ مجھے بدمزاج اور زبان دراز
کہتا ہے؟ ہائے وہی ڈھنگ کے ہوتے تو یہ دن دیکھنا کیوں نصیب
ہوتا۔ اور تم..... تم بھی مجھے ہی الزام دیتی ہو۔ سچ ہے بدنصیب کا
کوئی ساتھی نہیں ہوتا......" یہ کہہ کر جمیلہ رونے لگی۔ میں نے اُسے
گلے سے لگا کر کہا۔ "دیکھا نا، تم برا مان گئیں اسی لئے تو میں یہ قصّہ
چھیڑتے ڈرتی تھی۔ میرا تو صرف یہ مطلب ہے کہ یہ معلوم کروں کہ
آخر اس نا اتفاقی کی وجہ کیا ہے۔ لیکن اگر تمہیں بُرا لگتا ہے تو جانے
دو۔ میں کچھ نہ کہوں گی۔"

جمیلہ دھیمی ہو کر بولی: "بہن میں تمہیں سچا سچا حال سناتی ہوں تمہیں
میری قسم غور سے سننا اور انصاف سے کہنا کہ قصور کس کا ہے۔

میری ماں کا انتقال میرے بچپن ہی میں ہو گیا تھا اور باپ نے
کچھ دن بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ سوتیلی ماں نے مجھ پر جو جو
سختیاں کیں ان کا کیا ذکر کروں۔ مگر میں نے ہمیشہ اُسے خوش
رکھنے کی کوشش کی اور دن رات جان توڑ کر ان کی خدمت کرتی
رہی سارا خاندان اور ملنے جُلنے والے میری ماں کی بدمزاجی سے
واقف تھے اور ہر کوئی میری تعریف کرتا تھا کہ میں اس طرح ہنس
کھیل کر اس کی سختیاں برداشت کرتی ہوں۔ شادی کے بعد ساس
سے سابقہ پڑا۔ میں دل میں سمجھے ہوئے تھی کہ جب میں سنے سوتیلی
ماں کے ساتھ خوش اسلوبی سے نباہ کر لیا تو ساس کے ساتھ گزارہ

کرنا تو نسبتاً بہت آسان ہے۔ بہن یقین مانتا برسوں میں نے لونڈی
کی طرح اپنی ساس کی خدمت کی اور ان کے ہر جا بےجا حکم پر سر
جھکایا۔ صاحبزادے کہتے ساڑھی پہنو، اماں فرماتیں کہ ساڑھی کو ہاتھ
لگایا تو ہاتھ جلا دوں گی۔ بیٹے کہتے میرے ساتھ سینما چلو، سیر کو چلو
اماں کہتیں نوج شریف بہو بیٹیاں ایسی حرکتیں کریں، اور میں نہ جانے
کس کس تدبیر سے دونوں کا حکم مانتی اور دونوں کو خوش رکھنے
کی کوشش کرتی۔ روز ایسی باتیں ہوتیں، وہ بکتی جھکتیں برا بھلا کہتیں
اور میں چپ سر جھکائے سنتی رہتی۔ شادی کو سال بھی نہ گزرا
تھا کہ پوتے کی آرزو انھیں بےقرار رکھنے لگی۔ ہر وقت اس کا
ذکر میرا ناک میں دم کر دیا۔ کبھی تعویز گنڈے پہناتیں، کبھی مُلّا
سیانے ہاتھ دیکھتے، کبھی حکیم کو نبض دکھلائی جاتی اور کبھی نجومیوں
سے فال کھلواتیں۔ دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ بیٹے سے دوسری
شادی کا اصرار شروع کر دیا مگر انھوں نے ٹال دیا۔ بار بار کہا
تو انھوں نے کہہ دیا کہ "ایسی جلدی کیا ہے کون سے دس میں
برس گزر گئے، ہو جائے گا بچہ"۔ بس بہن قیامت آ گئی۔ سدا
سے ان کا دستور یہ تھا کہ قصور کرتا بیٹا اور سزا ملتی مجھے کہ "بہو نے
بہکا دیا ہے"۔ اس لڑائی کے کوئی سال بھر بعد یہ لڑکی پیدا ہوئی
اگرچہ لڑکی ہونے کا انھیں افسوس تو بہت ہوا مگر نہیں سے
ہاں بھلی۔ ذرا آنسو پچھ گئے۔ بچی کی پیدائش کے بعد اس کا کام

بڑھا سو الگ اور سسرال والوں کی باتیں اور زیادہ بڑھ گئیں
یہ کیوں کھایا، یہاں کیوں گئی، بچی کو پلنگ پر کیوں ڈالا۔ اُدھر شوہر
صاحب کی خفگی کہ تم بچی کے پیچھے مجھے بھول گئیں اور سسرال والوں
کا یہ اصرار کہ اس بچی کے پیچھے مرمٹو۔ گھر کے کام، شوہر کی ناز برداری
بچی کی پرورش اور سسرال والوں کی یورش میں ڈھائی سال اور
گزرے تھے کہ ایک اور لڑکی ہو کر مر گئی۔ اب تو اللہ اُن کی روح
کو نہ شرمائے، میری ساس کے ہاتھ ایک شگوفہ آگیا۔ ہر وقت اٹھتے
بیٹھتے یہ کہنا کہ اس کے لڑکا نہیں ہوگا۔ یہ منحوس گھر کی منحوس میرے
ہاں بھی نحوست پھیلانے آئی ہے اور نہ جانے کیا کیا بکتی رہتی تھیں
بیٹے سے اصرار کہ دوسری شادی کر، اور اپنی ایک رشتے کی بھانجی
تجویز بھی کر دی۔ بہن اب تک تو میں نے بہت ضبط کیا، مگر ایک
تو بچی کے جانے کا صدمہ اور پھر ساس کی یہ باتیں۔ میاں کو دیکھتی
ہوں تو وہ بھی اُکھڑے اُکھڑے کھنچے کھنچے رہتے ہیں کہ "تم تو ہر
دم مُنھ لپیٹے پڑی رہتی ہو، ہنستی بولتی نہیں، بال کیوں بکھرے
ہیں۔ کپڑے کیوں نہیں بدلتیں۔ ایسی ایسی پچاسیوں باتیں کہتے رہتے
ان کی باتیں میرے دل پر تیر کی طرح لگتیں۔ کئی سال یہی کش مکش
رہی اور مجھے بالا بالا معلوم ہوا کہ ماں بیٹے دونوں راضی ہیں اور نئی
شادی رچانے کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے، یہ میرے لئے
سخت روحانی عذاب کا زمانہ تھا۔ صحت خراب رہنے لگی۔ پہلے

اختلاج پیدا ہوا پھر ہسٹیریا کے دورے پڑنے لگے۔ مزاج میں چڑچڑاپن آگیا۔ کبھی ساس کی باتوں سے تنگ آکر انھیں کوئی جواب دے بیٹھتی کبھی "اُن" سے جھگڑ پڑتی۔ ساس ہر دم سُناتی رہتیں "میرے ایک ہی بچہ ہے میں تو دوسرا بیاہ کروں گی جو لڑکا ہو" جب یہ چھوٹا لڑکا پیٹ میں تھا اس زمانے میں بھی یہی کہتی رہتیں "لڑکا ہو چکا، لڑکی ہو گی۔ اے لڑکا نصیبے والوں کے ہوتا ہے۔ اس منحوس کے کیوں ہو گا" ایک دن جل کر میں نے کہا، لڑکا لڑکی کیا میں خود گھڑ لیتی ہوں۔ خدا کے حکم میں بھی آپ کو دخل ہے کہ جو آپ چاہیں وہ ہو۔ لیجئے اب تو بیمائی کا سارٹیفکٹ مل گیا۔ خیر جوں توں یہ زمانہ گزرا اور یہ میاں صغیر پیدا ہوئے، میری ساس کو اس کا تو افسوس ضرور ہوا کہ نئی بہو کس بہانے لاؤں گی مگر سچی بات یہ ہے کہ پوتا ہونے سے خوش بھی بہت ہوئیں، اور وہ میری خاصی آؤ بھگت کرنے لگیں۔ اور میاں بھی کچھ سیدھے ہو گئے۔ میری قسمت کی خوبی کہ اُدھر تو ساس چل بسیں اور اِدھر یہ آپا سلمہ اپنے جیٹھ دیوروں سے لڑ، بھائی کے پاس آگئیں۔ خدا جانتا ہے جب سے یہ آئی ہیں سچ مچ مجھے زندگی سے بیزار کر دیا ہر وقت تو تانے تشنے دیتی ہیں اور کلیجے میں ایسی چٹکی لیتی ہیں کہ بس میرا ہی دل جانتا ہے اور پھر ساری دنیا سے اُلٹا میرے مظالم کا اور بدمزاجی کا رونا روتی ہیں اور بھائی کے سامنے ایسی سیدھی سادی بن جائیں گی جیسے بہت ہی بے زبان اور مظلوم ہیں۔ میرا

مزاج کمبخت ایسا ہے کہ جو کہتی ہوں سامنے اور منھ پر۔ ظاہر داری مجھ سے نہیں ہوتی جو دل میں وہ زبان پر۔ اور ان سب کا یہ حال ہے کہ چپکے چپکے دل جلائے جائیں، چٹکیاں لئے جائیں اور دوسروں کے سامنے محبت پیار ظاہر کرتے ہیں۔ بہن خدا کی قسم اب تو ایسا دل پھٹ گیا ہے کہ ذرا بھی ان لوگوں کی جگہ میرے دل میں نہیں رہی۔ میری تو ساری عمر ہی مصیبت میں کٹی۔ ماں کا صدمہ اٹھایا، سوتیلی ماں کے ظلم سہے، پھر ساس نے کوئی دقیقہ ستانے کا باقی نہ چھوڑا اور اب نند صاحب ساری عمر کے لئے چھاتی پر مونگ دلنے کو موجود ہیں۔ پھر غصہ یہ آتا ہے کہ جس کے کارن یہ سب مصیبتیں اٹھائیں اور اٹھا رہی ہوں وہ بھی میری دل کی حالت کو نہیں سمجھتا اور مجھ سے ناراض رہتا ہے بدمزاج اور زبان دراز سمجھتا ہے۔ سارے دن گھر کے کاموں میں جُتی رہتی ہوں، بچوں کی مصیبت بھیٹوں، نند کی باتیں سنوں اور شام کو وہ آئیں تو وہ بھی مجھے ہی جلاتے اور الزام دیتے آئیں۔ سب کی باتیں چپ چاپ سُن لیتی ہوں بس ان کی نہیں سُنی جاتیں۔ پھٹ پڑتی ہوں۔ دنیا سمجھتی ہے کہ بڑی خوش نصیب ہوں۔ بال بچے ہیں، میاں ہے، روپیہ پیسہ اور اگر سلوک نہیں تو بیوی کا اپنا قصور ہے۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ میرے اندر والے میں گھن لگ گیا ہے۔ اب نہ مزاج کا سنبھالنا میرے بس کی بات ہے نہ صحت کو اور اب تو یہ امید بھی نہیں رہی کہ وہ مجھ سے کبھی خوش ہوں گے

اسے بہن اب تو مہ

اشک آنکھوں سے کب نہیں آتا — لہو آتا ہے جب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی ہر اک خواہش — گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

رنج و صدمے سے جمیلہ کا چہرہ متغیر ہو رہا تھا۔ ابھی اُس نے بات پوری نہیں کی تھی کہ شبیر صاحب کی آواز آئی اور وہ آنسو پونچھتی اُٹھ کر چلی گئی۔

میں بیٹھی یہ سوچتی رہی کہ اس دکھیاری کی داستان واقعی دردناک ہے اور ان حالات میں جو اُسے پیش آئے کسی کا بھی مزاج اپنی اصلی حالت پر نہیں رہ سکتا۔ ساتھ ہی بار بار مجھے یہ خیال آتا کہ گو جمیلہ قصوروار نہیں مگر مزاج کی خرابی سے تکلیف زیادہ تر اُسی کو پہنچتی ہے۔ شوہر اس سے نالاں ہے، رفتہ رفتہ صورت سے بیزار ہو جائے گا۔ اُس کی اپنی صحت ہر وقت کی جلن کڑھن سے روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔ پھر بچوں پر ماں کی بدمزاجی اور باپ کی نفرت کا کس قدر بُرا اثر پڑے گا؟ اس لئے جمیلہ کو کوشش کرنا چاہئے کہ جہاں تک ہو سکے اپنے مزاج کو سنبھالے۔ یہ کام اگرچہ مشکل ہے مگر ناممکن نہیں بہت سی خدا کی بندیاں ابھی ہندوستان میں یہ اور اس سے زیادہ مشکلیں ہنس کھیل کر اٹھاتی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا کہ اگر میں جمیلہ کے سامنے وعظ و نصیحت کا دفتر کھولتی ہوں تو اُس پر بہت ہی کم اثر ہوگا وہ مجھے یا تو اپنا دشمن سمجھے گی یا بے حس اور بے درد کہے گی۔ اس لئے مناسب یہ ہے اور میرا فرض بھی یہی ہے کہ میں اس کی ہمدردی کروں

دکھ سکھ اور مشکلات میں اس کا ساتھ دوں اور موقع موقع سے اُسے سمجھاؤں تاکہ اس کا مزاج بدل جائے۔

مجھے اب پوری طرح اندازہ ہوا کہ اس میں زیادہ تر قصور شبیر صاحب کا تھا۔ کاش کوئی انھیں سمجھاتا کہ یہ عورت سب کچھ سہہ سکتی ہے مگر شوہر کی بے مہری کو برداشت نہیں کر سکتی۔ جمیلہ کی بدمزاجی حقیقت میں بگڑی ہوئی محبت ہے۔ اس کا نرم اور نازک دل تمھاری ترش روئی سے پھٹ گیا ہے جس طرح دودھ کھٹائی سے پھٹ جاتا ہے۔

میل جول

جن باتوں سے انسان اور جانور میں تمیز کی جاتی ہے ان میں سے ایک بڑی بات انسانوں کا آپس کا میل جول بھی ہے۔ جانوروں میں بھی میل جول کا جذبہ پایا جاتا ہے مگر ان میں زیادہ تر ماں اور بچے کا فطری تعلق ہوتا ہے اور جیسے ہی بچہ بڑا ہوا یہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ مگر انسان میں یہ بات نہیں اس میں سب سے محبّت اور میل جول کی صلاحیت فطری طور پر موجود ہے اور ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

اب سے ہزاروں برس پہلے جب انسان کی تہذیب کا بالکل شروع کا زمانہ تھا، اس میل جول کی ابتدا ہوئی۔ شروع میں آدمی کا واسطہ زیادہ تر صرف اپنے بال بچوں سے رہا ہوگا، زمانے کی ضرورتوں اور انسان کی فطری محبّت کی وجہ سے خاندان کی ابتدا ہوئی۔ پھر کئی کئی خاندان مل جل کر رہنے سہنے لگے اور قبیلے کہلائے۔ ہوتے ہوتے ان ہی قبیلوں سے جرگے اور قومیں وغیرہ بن گئیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قدرت نے انسان کے اندر جو میل جول کی صلاحیت رکھی ہے وہ زمانے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔

اور اس زمانے میں تو خاص طور پر کسی قوم اور ملک کی ترقی اور تہذیب کو ناپنے اور تولنے کا پیمانہ ہی یہ ہے کہ اس کے تعلقات

دوسری قوموں اور دوسرے ملکوں سے کیسے ہیں اور اس کے میل جول کا حلقہ کتنا بڑا ہے۔

قوموں ہی کی طرح کسی انسان کے اخلاق اوصاف، اس کی اچھائی اور برائی مہذب اور غیر مہذب ہونے کا ثبوت بھی اسی سے ملتا ہے کہ وہ اپنے ملنے جلنے والوں سے کیسا ہے۔ اکل کھرا، گھر گھسنا اور بدمزاج یا ملنسار اور محبت والا؟

انسان کی سماجی زندگی کے شروع کے زمانے میں خاندان کی نیو رکھنے والی عورت تھی، مرد شکار کرتے اور زیادہ تر باہر رہتے تھے عورت گھر پر رہ کر بچوں کی دیکھ بھال، گھر کا کام اور (اکثر جگہ) کھیتی باڑی کرتی تھی۔ بچوں ہی کی وجہ سے خاندان کی ابتدا ہوئی اور کام کی خاطر دوسرے لوگوں سے میل جول پیدا ہوا اور اس طرح عورت نے خاندان اور قبیلے کی بنا ڈالی جو اب بڑھتے بڑھتے قوم کی شکل میں پہنچ گئی ہے اب ہزاروں برس بعد بھی خاندانی زندگی میں عورت کی اہمیت اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے جو شروع کے زمانے میں تھی۔ ہم آئے دن دیکھتے رہتے ہیں کہ عورت ہی کی وجہ سے اچھے خاصے سلوک اتفاق سے رہنے والے لوگوں میں نا اتفاقی اور چھوٹ چھٹاؤ ہو جاتا ہے اور عورت ہی ٹوٹے دلوں کو جوڑنے اور بگڑے گھر بنانے کا کام بھی کرتی ہے۔

خیر یہ چند ابتدائی باتیں تھیں۔ اب ہمیں اپنی سننے والی بہنوں سے اس بارے میں بات چیت کرنی ہے کہ ہم اپنے واسطے والوں سے کس

قسم کے تعلقات رکھیں کہ ہماری زندگی اچھی طرح گزرے اور کامیاب کہلائے۔ زیادہ تر جن سے ہمارا میل جول رہتا ہے وہ عزیز، پڑوسی، نوکر اور دوست ہیں۔ سب سے پہلے ہم بڑوں اور چھوٹوں کے آپس کے تعلق کو لیتے ہیں جو ہماری زندگی میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ چھوٹے بڑوں کے تعلق کی عام طور پر تین صورتیں نظر آتی ہیں، ایک وہ جس میں حد سے زیادہ ادب، خوف، سختی اور رعب ہے، چھوٹے بڑوں سے ڈرتے رہتے ہیں، ان کی ہر بات پر بجا اور درست کہتے، ان کے سامنے سر جھکائے ڈرے سہمے رہتے ہیں اور کسی معاملے میں اپنی رائے ظاہر نہیں کر سکتے۔ اور بڑے چھوٹوں پر حکومت کرنا اُن سے ہر بات منوانا اور زبردستی کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اس سے بزرگوں کا حکومت کرنے کا شوق تو ضرور پورا ہو جاتا ہے لیکن چھوٹوں کے دل میں وہ عزت اور دلی لگاؤ پیدا نہیں ہو سکتا جو ہونا چاہیئے۔

بگڑی ہوئی یورپی تہذیب کی وجہ سے بعض گھرانوں میں انتہائی بے تکلفی اور بے باکی کا طریقہ رائج ہو گیا ہے جس میں چھوٹے بڑے آپس میں بے باکانہ ہر قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ بے ہودہ ہنسی مذاق اور ڈھیٹ پن برتتے ہیں لیکن یہ طریقہ ہماری ہندوستانی معاشرت میں بے تکا اور نامناسب معلوم ہوتا ہے۔

ان دو راستوں کے علاوہ ایک بیچ کا راستہ بھی ہے اور یہ ہے دوستی اور بھروسے خلوص اور خدمت عزت اور محبت کا راستہ جس میں

بڑے چھوٹوں پر حکم نہ چلائیں بلکہ مشورہ دیں، نکتہ چینی، غصے اور خفگی کے بدلے نرمی اور دوستانہ طریقے سے کام لیں۔ اپنے احسانوں کو جو انھوں نے چھوٹوں پر کئے ہیں، جتائیں نہیں بلکہ خود نمونہ بن کر دکھائیں کہ وہ بھی اسی طرح ایثار کرنے والے بنیں۔ چھوٹوں کے جذبات اور رائے کی عزت اور ان کی طبیعت کو سمجھنے کی کوشش کریں، ان کی باتوں کو سن کر فضول اور بے کار سمجھ کر رد نہ کر دیں بلکہ غور کر کے انھیں مشورہ دیں اور سمجھائیں۔ ان کے حوصلوں اور اُمنگوں کو دبانے کے بجائے اُبھاریں اور یہ سمجھ لیں کہ یہی ننھی پود آگے چل کر تناور درخت بننے والی ہے۔ اگر ابھی سے اس کی جڑ مضبوط نہ کی گئی تو یہ پودے ہمیشہ کمزور رہیں گے اور دنیا کی مشکلوں کی آندھیوں کو نہ سہہ سکیں گے۔ رعب اور سختی کے برتاؤ سے زیادہ تر بچے دب کر رہ جاتے ہیں ان میں رائے کی آزادی، اپنے پر بھروسہ اور خود اعتمادی، حوصلہ اور اُمنگ، صاف گوئی اور جوش پیدا نہیں ہوتا۔ اور جو بچے تیز اور چالاک ہوتے ہیں وہ سرکش، بدتمیز اور بے باک ہو جاتے ہیں اور ان کی طبیعت باغیانہ ہو جاتی ہے۔ ان کے دل میں بڑوں کی عزت کی جگہ نفرت بیٹھ جاتی ہے وہ انھیں ظالم، ہوّا اور نا انصاف سمجھتے اور اس آرزو میں رہتے ہیں کہ ان سے کسی طرح چھٹکارا ملے۔

اب رہے چھوٹے تو انھیں بزرگوں کا ادب کرنا چاہیے۔ ان کی باتوں کو غور سے سننا اور ان کے مشوروں پر عمل کرنا اور ان کے حکموں کو خوشی سے ماننا چاہیے، صرف اس لئے نہیں کہ وہ ان سے کچھ مدت پہلے دنیا

میں آئے تھے بلکہ اس لئے وہ علم اور تجربہ میں عقل اور سمجھ میں ان سے زیادہ ہیں۔ خدمت اور ایثار ان سے زیادہ کرتے اور کر سکتے ہیں اور ان کی برائی بھلائی کو ان سے زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اگر کسی وقت بزرگ غلطی پر بھی ہو تو اس سے حجت اور تکرار نہیں کرنا چاہیئے۔

بے تکلفی اور دوستی کے باوجود بزرگوں کا ادب اور عزت ہمیشہ کرنی چاہیئے۔ بزرگوں اور خوردوں کے برتاؤ کا سب سے صاف سیدھا اور خوب صورت راستہ یہی ہے۔

ہماری تہذیب اور معاشرت میں پڑوسیوں کو ایک خاص درجہ دیا گیا ہے۔ مذہب اور سماج دونوں نے پڑوسیوں سے اچھے تعلقات رکھنے کی تاکید کی ہے۔ ایک کہاوت ہے "اپنے دور پڑوسی نیڑے" ایک اور کہاوت ہے "حق ہمسایہ ماں کا جایا" مطلب یہ کہ اپنے عزیز تو دور رہتے ہیں اور پڑوسی ہمیشہ قریب رہنے والے ہیں اور اس لئے ان کا حق سگے بھائیوں کے برابر سمجھنا چاہیئے بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ سب تاکید اس لئے ہے کہ انسان کو اپنے ہمسایوں سے بہت زیادہ واسطہ پڑتا ہے۔ ان سے نا اتفاقی ہو تو وہ بہت زیادہ پریشان کر سکتے ہیں اور دوستی اور سلوک ہو تو سب سے زیادہ کام بھی وہی آسکتے ہیں اس لئے اچھا ہمسایہ خدا کی بڑی نعمت سمجھا جاتا ہے۔ بہر حال اپنے ہمسایوں سے محبت سے ملنا، ان کے دکھ سکھ میں شرکت کرنا اور ضرورت کے وقت ان کی مدد اور خدمت

کرنا ہر انسان کو اپنا فرض سمجھنا چاہیئے۔

آئیے اب ذرا نوکروں کے بارے میں سوچیں کہ کیا کرنا چاہیئے کچھ مدت پہلے تک بجائے نوکروں کے "پرجا" یا "کمین" کام کرتے تھے اور آقا "ججمان" کہلاتے تھے۔ ان ججمانوں اور پرجا میں خاص قسم کے تعلقات تھے پرجا ججمان کا ہر حکم دل وجان سے مانتی تھی ججمان بھی پرجا کے حقوق کا خیال رکھتے تھے۔ اور ان کے دکھ سکھ میں کام آتے اور مدد کرتے تھے اب ایک طرف تو پرجا کو اپنے حقوق کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ دوسری طرف اکثر نئے زمانے کے لوگوں نے پرجا اور نوکروں کے حقوق بھلا دیئے ہیں، اور ان کو محض مشین فرض کر لیا ہے جس میں صرف تنخواہ کا تیل دینا کافی سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے نوکر اور آقا کا مسئلہ ہماری سماجی زندگی میں دن بہ دن مشکل ہوتا جاتا ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو نوکروں پر سختی کرنا، انھیں ذلیل سمجھنا اور گالیاں کوسنے دیتے رہنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ دنیا میں محض ہماری خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں وہ نہ ان کے حقوق کی پروا کرتے ہیں نہ ان کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ بھی ہماری طرح انسان ہیں اور دکھ درد، عزت ذلت کا احساس ان میں بھی موجود ہے اصل میں ایسے لوگ خود انسان کہلانے کے قابل نہیں۔ ان کے نوکر ان سے ہمیشہ نفرت کرتے اور پیٹھ پیچھے برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔

ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو اپنے نوکروں سے بہت بے تکلف ہو جاتے ہیں اور انھیں اپنا مصاحب سا بنا لیتے ہیں اور گھر کے ہر معاملے

میں ان کا دخل ہوجاتا ہے۔ ایسے نوکر سر چڑھ جاتے ہیں۔ گستاخ، بدتمیز اور کام چور ہوجاتے ہیں اور رشتہ داروں میں آپس میں لڑائی جھگڑا کرا دینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ایسے گھروں میں نہ کام اچھی طرح ہو سکتا ہے نہ آپس میں سلوک رہتا ہے۔ بعض لوگ نوکروں سے ڈرنے لگتے ہیں کہ کہیں یہ خفا ہو کر چلے نہ جائیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے ہاتھ سے کام نہیں کر سکتے اور نوکروں کے بھروسے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے نوکر آقا کی اس کمزوری سے واقف ہونے کے بعد بہت سرکش ہوجاتے ہیں۔ من مانی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ نوکری چھوڑ دینے کا ڈراوا دے کر اپنے مطالبات منواتے رہتے ہیں اور آقا کو طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں۔

نوکروں سے عزت اور نرمی سے پیش آئیے۔ ان کے دکھ سکھ میں شرکت کیجئے ان سے ہمدردی رکھئے، محبت کیجئے۔ وقت پڑے تو خدمت سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہئے مگر ان سب کے باوجود انھیں سر نہ چڑھانا چاہیئے کہ وہ گستاخ اور بدتمیز ہوجائیں یا آپ کے ذاتی معاملات میں دخل دینے لگیں۔ نہ ان پر اتنا بھروسہ کیجئے کہ وہ موقع پا کر آپ کو لوٹ لیں نہ اتنا شک کیجئے کہ انھیں بالکل بے ایمان اور لٹیرا سمجھتے رہیں۔

اب ہم اس تعلق کی طرف آتے ہیں جو نہ تو قدرتی ہے نہ ضرورت اور مجبوری بلکہ دلی محبت، خوشی اور خواہش کا واسطہ ہے یعنی دوستی۔ اس سے زیادہ پیارا اور خلوص کا رشتہ دنیا میں شاید ہی کوئی اور ہو۔

سچی دوستی وہ نعمت ہے جس کا بدل دنیا کی قیمتی سے قیمتی چیز بھی نہیں ہو سکتی، اس کی ہمیشہ دل سے قدر کرنی چاہئے۔

دوستی کا پہلا اصول یہ ہے کہ اس میں خلوص اور بے تکلفی ہو ورنہ وہ دوستی نہیں رسمی ملاقات ہو گی، دوست کے رنج سے رنجیدہ اور خوشی میں خوش ہونا تو قدرتی بات ہے لیکن وقت پڑنے پر دوست کی مدد اور خدمت کرنا اور اس کے لئے ایثار کرنا یہ ثابت کر دیتا ہے کہ یہ دوستی سچی اور دلی دوستی ہے۔ ایک بات اور یاد رکھنی چاہئے کہ دوست کے ہر معاملے میں دخل دینا نہیں چاہئے، ہاں صرف اس وقت جب وہ خود مشورہ مانگے۔ لیکن اگر یہ دیکھیں کہ ہمارا دوست سراسر کوئی بےجا یا بڑی بات کر رہا ہے یا ایسے رستے جا رہا ہے جس سے اُسے نقصان اٹھانا پڑے گا اس وقت ضرور اسے روکنا اور سمجھانا چاہئے۔ بہت ممکن ہے کہ اس سے وہ ناراض ہو جائے، کیونکہ سچ کی کڑواہٹ کو بہت کم لوگ برداشت کر سکتے ہیں لیکن اس کی عارضی خفگی کا خیال نہ کر کے اس کو صحیح راستے پر ڈالنے کی کوشش سچے دوست کا فرض ہے۔

رشتہ داروں میں ایک تعلق برابر والوں (ہم عمروں) کا ہوتا ہے۔ یہ رشتہ بزرگوں اور خوردوں کے رشتے سے بھی زیادہ نازک اور اُلجھا ہوا ہے، بزرگوں کی بات ماننی پڑتی ہے، چھوٹوں کو سمجھایا جا سکتا ہے مگر اس میں دونوں اپنے کو دوسرے سے بڑھ کر سمجھتے ہیں اور اس لئے اکثر برابر کے بہن بھائیوں میں (خواہ سگے ہوں یا رشتے

کے لڑائی جھگڑے اور کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ دراصل اس میں بھی دوستی والا طریقہ برتنا چاہئے۔ اوّل تو دونوں میں سے جس کی بات ٹھیک ہو، دوسرا اُسے مان لے دوسرے ہر بات میں ٹانگ نہ اڑائے اور اگر آپس میں کسی طرح بھی نہ پٹ سکتی ہو تو بجائے لڑنے جھگڑنے کے بہتر یہ ہے کہ ملنا جلنا کم کر دیا جائے۔ اگرچہ یہ آخری اور بالکل مجبوری کی صورت ہے ورنہ ہم عمر عزیز جن میں سے اکثر بچپن کے ساتھی اور دوست بھی ہوتے ہیں، بہت قابلِ قدر ہیں جن سے عموماً بہت محبت ہوتی ہے اور جہاں دلی محبت ہو وہاں نااتفاقی اگر ہوگی بھی تو چند دن کے لئے۔ پھر دل صاف ہو جائیں گے۔

آخر میں چند جملے سسرالی رشتہ داروں کے بارے میں بھی کہنا چاہتی ہوں، عزیز داری اور دوستی کون کنایا خوشی کا واسطہ ہے۔ لیکن سسرالی رشتہ داری ہندوستانی عورت کے لئے ایک مصیبت اور پریشانیوں کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ اور یہ وقت اس کی بڑی آزمائش کا ہوتا ہے اس لئے اس راہ میں بہت سوچ سمجھ کر اور سنبھل کر چلنا چاہئے۔ اس کٹھن راستے میں قدم قدم پر صبر، ہمت، برداشت اور درگزر کی ضرورت ہوتی ہے۔ عورت کی ابتدائی زندگی یعنی میکہ ایک درسگاہ کی حیثیت رکھتا ہے جس میں وہ تعلیم پاتی ہے اور سسرال امتحان کا کمرہ جس میں اس کی تعلیم کی جانچ ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ممتحن ناانصاف اور سخت گیر ہوں مگر بہرحال جو لڑکی اپنے ان نئے رشتہ داروں کو محبت، سلوک، خدمت

اور برداشت سے کام کرے وہی کامیاب کہلائے گی اور اس کی تعلیم مکمل اور عمدہ سمجھی جائے گی۔

بات یہ ہے کہ ہر قسم کے میل جول میں خلوص، ایثار اور صداقت سے کام لینا چاہیئے۔ یہی ہتھیار ہیں جن سے لوگوں کے دل فتح کئے جا سکتے ہیں، اور خاندانی و سماجی زندگی میں یہی چیز عورت کو کامیاب بنا سکتی ہے۔

عزیز ہوں یا دوست، پڑوسی ہوں یا نوکر چاکر، سسرالی رشتہ دار ہوں یا میکے کے ان سب سے میل جول اور تعلقات رکھنے کی ایک اہم اور ضروری شرط یہ بھی ہے کہ ہر ایک اپنے فرائض ادا کرے اور حقوق پر زیادہ زور نہ دے آج کل اپنے حق پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور فرض کی طرف سے بے پروائی برتی جاتی ہے۔ یہ بڑی غلطی ہے ہمیں حق سے زیادہ فرض کا خیال رکھنا چاہیئے دوسرا اپنا فرض ادا نہ کرے یعنی ہمارے حق کا خیال نہ رکھے تو ہم اسے مجبور نہیں کر سکتے لیکن اپنا فرض ادا کرنا ہمارے بس کی چیز ہے اور وہ ہر صورت میں ادا کرنا چاہیئے اور ضرور (اس سے یہ مطلب نہیں کہ اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائے نہیں حق کا مطالبہ بھی ضرور کرنا چاہیئے، مگر اتنا زیادہ نہیں کہ فرض سے غافل ہو جائیں)

اگر ہم ان گروں کو سمجھ لیں اور انھیں اپنی زندگی کا اصول بنا لیں تو ہماری زندگی مسرت سے بھرپور رہو۔ ہم نہ صرف دنیا میں خوش و خرم رہیں بلکہ ہمارا ضمیر بھی مطمئن ہو اور خدا کے سامنے بھی سرخ رو ہو جائیں۔

——— ✱ ———

ہمارا اخلاق

ہماری بول چال میں اخلاق کا لفظ کئی معنوں میں بولا جاتا ہے۔ فلاں کا اخلاق بہت اچھا ہے۔ یعنی وہ لوگوں سے خوش مزاجی سے ملتا جلتا ہے۔ فلاں کے اخلاق و عادات خراب ہیں یعنی اس کا چال چلن ٹھیک نہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اخلاق کے اصلی معنی ہیں اعلیٰ سیرت اور بلند معیار زندگی۔ یعنی وہ اعلیٰ قدریں حاصل کرنا جو انسان کو انسان بناتی ہیں اور جن کو اخلاقی قدریں کہتے ہیں۔ یعنی خدا کی رضا اور خوشنودی۔ علم۔ حسن۔ طاقت۔ ایثار عفت، دولت وغیرہ۔

سب سے بلند اور اہم قدر اپنے پیدا کرنے اور پالنے والے قادر مطلق کی محبت اور اس کے احسانات کا اعتراف کرنا ہے یعنی اپنی ساری زندگی میں اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہر وقت اس بات کا خیال رکھنا کہ اپنے معبود حقیقی کی رضا اور خوشنودی کے خلاف کوئی کام نہ کریں، اور اس کے بتائے ہوئے احکام خوشی سے بجالائیں اور اس کی رضا پر صابر اور شاکر رہیں۔

علم۔ یعنی جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اس کی حقیقت جاننا اور سمجھنا۔
حسن۔ یعنی اس خوش نمائی اور ہم آہنگی کو محسوس کرنا اور لطف اٹھانا جو خدا کی پیدا کی ہوئی یا انسان کی بنائی ہوئی چیزوں میں پائی جاتی ہے۔

طاقت۔ اپنے اندر قوت پیدا کرنا اور اس کا صحیح اور مناسب استعمال۔
ایثار۔ یہ قدر بہت بلند اور اونچا درجہ رکھتی ہے۔ یعنی اپنے فائدے اور غرض کو چھوڑ کر دوسرے کے فائدے کا خیال رکھنا، اپنے پر تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچانا اور دوسروں کے لئے ہر ممکن قربانی کرنا۔ یہ انسانی زندگی کا سب سے اونچا معیار ہے۔
عفت۔ یعنی حیا اور شرافت کے ساتھ اپنے کیرکٹر کی حفاظت کرنا، اور سختی و مضبوطی سے اپنی اور دوسروں کی عزت کا پاس کرنا۔
افادہ۔ یعنی ان چیزوں کا حاصل کرنا جو زندگی کو قایم رکھنے، اور خوش گوار بنانے میں مدد دیں۔ مثلاً دولت، صحت وغیرہ۔ اگرچہ یہ سب سے کم درجہ کی چیز ہے۔ مگر ہے بہت ضروری۔ اس قدر کے حاصل کرنے میں خاص طور پر اعتدال کا خیال رکھنا پڑتا ہے، دولت محض ضرورت کے قابل حاصل کرنا اور جو حاصل کر لی جائے اُسے مناسب طریقے سے اپنے اور دوسروں کے فائدے کے لئے خرچ کرنا چاہیئے۔ اگر دولت کمانے کا مقصد چاندی سونے کے ڈھیر لگانا اور روپیہ کو محض عیش و عشرت کی زندگی میں صرف کرنا ہو تو دولت اخلاقی قدر نہیں بدترین لعنت بن جاتی ہے۔
کسی انسان کے اخلاق کی سب سے بہتر تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ اس میں ان میں سے اکثر صفات کسی نہ کسی حد تک موجود ہیں جس شخص میں یہ سب صفات پوری طرح موجود ہوں وہ انسانِ کامل کہلاتا ہے اور اگرچہ انسانِ کامل دنیا میں بہت کمیاب ہیں مگر نایاب نہیں اور کوئی

زمانہ ان سے خالی نہیں ہوتا۔ عام انسانوں میں بھی ان صفات کا کسی نہ کسی حد تک موجود ہونا لازمی ہے ورنہ وہ انسان کے بجائے حیوان کہلانے کا مستحق ہے۔

ان اعلیٰ قدروں میں سے (جنھیں میں اخلاقی صفات کہوں گی) بعض ایسی ہیں جن کو مرد عورتوں سے زیادہ حاصل کر سکتے ہیں اور بعض ایسی ہیں جن میں عورتیں مردوں سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اس کے دو سبب ہیں۔ کچھ تو قدرت نے عورت اور مرد کے جسم اور دماغ کی ساخت میں فرق رکھا ہے اور اس وجہ سے یہ دونوں بعض بعض صفات کو زیادہ آسانی اور خوبی کے ساتھ اپنا سکتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ صدیوں کے رسم و رواج، سماجی بندشوں اور حاکم محکوم ہونے کے سبب مرد اور عورت کے دماغ اور جسم کی صلاحیتوں میں تضاد پیدا ہو گیا ہے، جہاں عورت میں مظلوم اور محکوم ہونے کے سبب علم، طاقت، دولت وغیرہ حاصل کرنے کی صلاحیت کم ہو گئی وہاں مرد حاکم اور جابر ہونے کی وجہ سے ایثار، عفت اور خدا پرستی جیسی بلند قدروں کے حاصل کرنے میں عورت سے بہت پیچھے رہ گیا کیونکہ یہ مسلمہ بات ہے کہ غلامی سے اگر محکوم کو نقصان پہنچتا ہے تو اس سے بھی زیادہ حاکم کی اخلاقی صفات میں تنزل پیدا ہو جاتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کون سی اخلاقی صفات مرد میں زیادہ ہیں اور کون سی عورت میں، مثلاً طاقت میں مرد عورت سے بڑھ کر ہے اس میں شجاعانہ کام کرنے اور مشکل سے مشکل مرحلے کو آسان بنانے کی صلاحیت موجود

اور عورت اس میں اُس کی برابری نہیں کرسکتی۔ دولت کمانا بھی ہزاروں برس سے مرد کے ذمے پہلا آتا ہے اور اُسے حاصل کرنے کی جو ترکیبیں اور چالیں اُسے معلوم ہیں عورت اُن سے ناواقف ہے۔

علم و فن۔ لوگ کہتے ہیں کہ قدرت سے علم حاصل کرنے اور فنونِ لطیفہ مثلاً ادب، آرٹ وغیرہ میں کمال حاصل کرنے کی جو صلاحیت مرد کو ملی ہے عورت کو نہیں ملی، اور یہی وجہ ہے کہ معیاری علم، ادب آرٹ میں عورت مرد کے برابر نام پیدا نہیں کرسکی اور وہ مشکل شکار، خالص علمی مسئلے اس کی پہنچ سے باہر رہے جہاں مردوں کی نکتہ رس نگاہ اور ذہن رسا آسانی سے پہنچ گیا۔ ممکن ہے یہ خیال صحیح ہو یا زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ سینکڑوں برس سے مردوں اور عورتوں کے کاموں کی الگ الگ تقسیم محکومی اور مجبوری کی وجہ سے آہستہ آہستہ اس کے دماغ میں علم اور آرٹ کے پیچیدہ اور نازک مسائل کو سمجھنے کی اہلیت کم ہو گئی ہو۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ طاقت، علم، آرٹ، دولت وغیرہ حاصل کرنے میں جس قدر مرد کامیاب ہوتا ہے اتنی عورت نہیں ہوتی لیکن اس میں کلام نہیں کہ بہت سی ایسی عورتیں بھی گزرتی ہیں جنھوں نے علم، آرٹ، شجاعت وغیرہ میں کافی نام پیدا کیا۔ ہاں نسبتاً ان کی تعداد بہت کم رہی اور بہرحال اس سے کوئی بھی انکار کر ہی نہیں سکتا کہ ۔

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اُسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

مان لیا کہ بعض چیزوں میں عورت مرد کی برابری نہیں کرسکتی۔ لیکن جن باتوں میں مرد اس سے بہت کم ہے ان کو بھی تو دیکھ لیجئے۔

خدا کی رضا اور خوشی کی فکر ہمیشہ عورت کو رہتی ہے اور مذہبی روح و خدا کی محبت اس میں مرد سے زیادہ موجود ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ہر ملک اور ہر قوم میں مذہب کی امین، اسے زندہ اور باقی رکھنے والی ذات عورت کی ہے۔ اخلاق کی یہ سب سے بڑی اور اہم صفت عورت میں پوری طرح موجود ہے۔

اپنی عزت کی پاسداری کرنا، غیرت، حیا اور نیک چلنی میں ہر ملک کی عموماً اور ہمارے ہاں کی عورتیں خصوصاً مردوں سے کہیں زیادہ ہیں، آج کل اخلاقی پستی کی یہ حالت ہے کہ بہت سے لوگ جو بزعم خود مہذب تعلیم یافتہ اور عقلمند ہوتے ہیں، چال چلن کے بارے میں محتاط نہیں اور اسی وجہ سے عام طور پر مردوں کا اخلاق (چال چلن) سختی سے نہیں جانچا جاتا اور وہ خود بھی اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے لیکن عورتیں جن میں جاہل اور نچلے طبقے کی عورتیں بھی شامل ہیں عموماً سختی اور ایمانداری کے ساتھ اپنی عزت کی نگہبانی کرتی اور اپنا سب سے بڑا جوہر اپنی عفت کو سمجھتی ہیں۔

مردوں میں سب سے بلند معیار زندگی یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان صرف اپنے ہی لئے سب کچھ نہ کرے، محض اپنے ہی حقوق کا خیال نہ رکھے بلکہ اس کا نقطۂ نظر زیادہ اونچا ہو، وہ اپنے ملک، اپنی قوم اور اپنے

خاندان کی خدمت بھی کرے اور ان کی بھلائی اور بہبودی کا خیال رکھے جو شخص خلوص اور بے غرضی سے دوسروں کے لئے ایثار اور خدمت کر سکے وہ زندگی کے سب سے بلند معیار پر پہنچ جاتا ہے۔ اب آپ غور کیجئے کہ مرد کی زندگی کا جو سب سے اونچا معیار ہے وہ عورت کا پہلا اور ضروری فرض ہے اس کی زندگی تو شروع ہی خدمت اور قربانی سے ہوتی ہے۔ قدرت نے عورت میں خدمت اور قربانی کی صلاحیت مرد سے کہیں زیادہ رکھی ہے اور اگرچہ سماجی حالات اور رسم و رواج نے اس کی بعض اور صلاحیتیں کم کر دی ہیں لیکن اس کی یہ صفت جو عورت کی جان اور اس کی آن ہے اس میں پوری طرح موجود ہے، اور اس میں مرد اس کی برابری کر ہی نہیں سکتا۔ آپ عورت (خصوصاً ہندوستانی عورت) کی پوری زندگی دیکھ جائیے، کوئی دور بھی اس سے خالی نہیں۔ وہ بیٹی ہو یا بہن، بیوی ہو یا ماں ہر حالت میں اپنے پر تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتی ہے۔

بیوی بن کر شوہر پر (خواہ وہ مزاج اور عادات میں کیسا ہی برا کیوں نہ ہو) وہ جس قدر محبت نثار کرتی اور اس کے حکموں کو دل و جان سے بجاتی اور اس کی سختیوں کو صبر و شکر سے سہتی ہے اور اس کے آرام اور خدمت کا جتنا خیال رکھتی ہے وہ ساری دنیا جانتی ہے۔ اگر قدرت نے عورت میں ایثار اور خدمت کی یہ صلاحیت نہ رکھی ہوتی تو یہ دنیا کب کی ختم ہو جاتی بچے کی پیدائش سے پہلے اور بعد ماں جس قسم کی شدید تکلیف اٹھاتی ہے اُسے کوئی مرد سمجھ بھی نہیں سکتا، ویسے تو انسان کی فطرت یہ ہے کہ جس سے

اسے تکالیف پہنچے وہ اس سے محبت نہیں کرتا مگر عورت کی خصلت بحیثیت ماں کے، اس کے بالکل برعکس ہے جو بچہ ماں کے لئے زیادہ تر تکلیف کا باعث ہوتا ہے وہ اس کا اور زیادہ لاڈلا اور چہیتا بن جاتا ہے۔ پھر عورت کا فرض محض جانوروں کی طرح پیدائش کے بعد ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اُسے گوشت کے اس بدصورت لوتھڑے کو پال پوس کر بڑا کرنا ہوتا ہے اور کم سے کم پندرہ بیس برس تک اس کی پرورش، تعلیم و تربیت اور دیکھ بھال کے فرائض اس پر عائد رہتے ہیں جنھیں وہ ضرورت سے زیادہ مستعدی اور خوشی سے پورا کرتی ہے۔

باپ تو عموماً دو تین بچوں کے بعد ہی گھبرا جاتا ہے، اور ان کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر کوفت اور پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس کا کام اتنا ہی ہے کہ وہ بچوں کے کھانے پہننے کا یا بڑے ہونے پر تعلیم کا انتظام کر دے اس سے زیادہ بہت کم مرد کچھ کرتے ہیں۔ اس پر بھی یہ حال کہ بچہ ذرا رویا اور ابّا جان برس پڑے "کیا مصیبت میں جان ہے، جب دیکھو گھر میں شور و غل اور قیامت برپا رہتی ہے۔ ہر وقت یہ کیوں رویا کرتا ہے، جب دیکھو چیخ رہا ہے، دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو گئی۔ سو میں نہیں سکتا، کام میں نہیں کر سکتا۔ تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ ذرا بچے کو چپ کر لیا کرو۔ خدا ایسی اولاد سے محفوظ رکھے، اس سے تو بے اولاد رہتے تو اچھا تھا"۔ بچوں کی تعداد بڑھنے لگی تو والد صاحب حد سے زیادہ نالاں اور بیوی تک سے بیزار ہیں گویا اس کی سراسر ملزم وہی غریب ہے۔ گھر میں بیٹھنے تک کے روادار نہیں، آمدنی کافی نہیں ہوتی تو اس کا غصہ بھی بیوی پر ہی اتارا جاتا ہے۔ دوسری

طرف ماں کو دیکھئے کہ انتہائی جسمانی اور ذہنی اذیت اٹھانے کے باجود وہ بچوں سے کبھی بیزار نہیں ہوتی۔ اپنے کھانے پہننے کو ہو یا نہ ہو ان کے لئے کسی نہ کسی طرح ضرور انتظام کرے گی۔ مہینوں اُسے نیند بھر کر سونا نصیب نہیں ہوتا مگر (خدا جانے کیسے) اس کی قوت برداشت اُسے خاموشی سے سہہ لیتی ہے دن میں آرام لینا تو بڑی بات ہے اطمینان سے ذرا دیر بیٹھنا بھی نہیں ملتا۔ پھر بھی کیا پرواہ ہے؟ وہ ماں ہے جس کا کام ہی یہ ہے کہ دن رات اپنے پر تکلیف اٹھا کر خدمت کرے۔ ایک گود میں ہے، ایک سر پر سوار ہے ایک پاس کھڑا رو رہا ہے اور ایک اور صاحب عالم وجود میں آنے والے ہیں۔ اٹھنا بیٹھنا تک دوبھر ہو رہا ہے مگر حیرت ہے کہ نہ اُسے اُن سے نفرت ہوتی ہے نہ بیزار ہے۔ اگر پریشان ہو کر، عاجز آ کر کبھی مُنہ سے بیزاری کا اظہار کر بھی دے تب بھی یہ ناممکن ہے کہ اُن سب کے علاوہ جب اور بچہ ہو جائے تو وہ اس کے پالنے پوسنے اور خدمت میں کوتاہی کرے یا اس کی امتا اور محبت میں فرق آ جائے (ہاں یہ یاد رکھئے کہ مستثنیات بہر حال ضرور موجود ہیں) دس بچے ہیں گیارھواں ہو کر مر گیا اب خواہ وہ بدصورت بیمار یا نصیب لڑاتا ہی ہو مگر ماں اس کے لئے بیقرار ہے اور رو رو کر جان دے دیتی ہے۔ لوگ حیران ہوتے ہیں کہ یہ رنج کی بات ہے یا شکر کرنے کی لیکن وہ عورت کی فطرت سے پوری طرح واقف نہیں کہ قدرت نے اس میں محبت خصوصاً بچے کی محبت اس قدر وافر رکھی ہے کہ اس کے لئے ہر بچہ یکساں ہے اور اسی محبت اور خدمت کے بل پر اس دنیا کی کل

چل رہی ہے، ورنہ اگر ماں کی فطرت بھی عام لوگوں جیسی ہوتی تو ماں بچے کے لئے جیسی جیسی مصیبت بھرتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ بچہ کے پیدا ہوتے ہی وہ گوشت کے اس گھناؤنے لوتھڑے کو جس نے اُسے اس قدر اذیت دی اٹھا کر دور پھینک دیا کرتی۔

مگر خدمت اور محبت ایثار اور قربانی ہی تو عورت کی زندگی کا مقصد اور اس کی جان ہے۔ اس کے بغیر وہ بے جان کا جسم، بے روح کا ڈھانچہ، بے خوشبو کا پھول ہے، وہ اپنے پیاروں کے لئے تکلیف اٹھا کر، ان کی خدمت کر کے اور ان کی محبت میں اپنے کو تج کر ہی سکون اطمینان اور راحت حاصل کر سکتی ہے۔ علم، آرٹ، طاقت، دولت کوئی بھی اس کی تسکین کا باعث نہیں ہو سکتا، اسے راحت حاصل ہوتی ہے محض خدا پر سچا عقیدہ رکھ کر اور اس کی مخلوق سے محبت اور ان کی خدمت کر کے۔ یہی اس کا جوہر ہے اور یہی اس کی فطرت۔

آخر میں اتنا اور کہوں گی کہ اگرچہ عورت کا سب سے بڑا جوہر اس کا ایثار ہے لیکن بہرحال عورت بھی انسان ہے، اس میں بھی احساسات اور جذبات ہیں، محبت کے ساتھ نفرت بھی کر سکتی ہے، انسانی کمزوریاں اس میں بھی موجود ہیں، اس لئے اُسے مافوق الفطرت ہستی سمجھ لینا اور من مانی باتیں اس کی طرف منسوب کر کے یا تو اُسے شیطان سے بدتر بتانا یا فرشتوں سے بڑھا دینا مردوں کی خود غرضی ہے عورت سے یہ توقع نہ کیجئے کہ وہ ہر ایک کے لئے بغیر کسی خاص سبب کے ایثار اور قربانی

کرے گی جس سے اُسے محبت ہے اس کے لئے تو وہ سب کچھ کرسکتی ہے، کرتی ہے اور کرتی رہے گی، لیکن اگر سب متعلقین اس سے یہ چاہیں کہ جیسی قربانی وہ اولاد کے لئے کرتی ہے ایسی ہی سب کے لئے کرے تو یہ ان کی غلطی ہے وہ خدمت ایثار اور محبت کرتی ہے تو محبت کے بدلے محبت اور عزت چاہتی بھی ہے۔ اگر اسے محبت کے بدلے میں نفرت یا لاپروائی ملے تو اس کا دل ٹوٹ جاتا ہے وہ فطرت سے یا حالات کے تقاضے سے مجبور ہوکر خدمت اور ایثار کرتی بھی رہے گی مگر اس کے دل میں گھن لگ جاتا ہے۔ ہندوستانی مرد نے یہ فرض کرلیا ہے کہ وہ ہر حال میں خواہ بدچلن، بدمزاج، بدزبان اور بے پرواہو، خود بیوی کا ذرا بھی خیال اور اس سے محبت نہ کرے، ہر حال میں اس کا محبوب اور دیوتا بنا رہے گا۔ یہ خطرناک غلطی ہے عورت بھی اچھے بُرے میں، نیک بد میں، محبت نفرت میں تمیز کرسکتی ہے، وہ مرد جو خود بیوی سے محبت اور اس کی عزت کرے بے شک اس سے محبت اور ایثار کی توقع کرے اور اُسے اعلیٰ اخلاقی معیار پر پرکھے لیکن جو لوگ خود اس معیار پر پورے نہیں اُترتے وہ یہ سمجھ لیں کہ اب وہ زمانہ گیا جب خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے محض خاندانی روایات یا رسم و رواج کے بل پر وہ عورت کی محبت اور ایثار نہیں خرید سکتے۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے خود اس سے ایمان داری سے محبت اور اس کی سچی عزت کرنا۔ کیونکہ وہ بے جان مشین نہیں بلکہ انسان ہے انسانی کمزوریوں اور خوبیوں دونوں سے مزین

———— ✻ ————

اپنوں کی باتیں

اسلام میں عورت کے حقوق

یہ ربیع الاوّل کا مہینہ ہے اور اسی مہینے میں مسلمانوں کی سب سے بڑی خوشی کا دن ہے۔ ہم جو عیدیں مناتے ہیں وہ اپنے رسول کریم کے بتائے ہوئے احکامات بجا لانے کی خوشی میں مناتے ہیں۔ یہ مہینہ اسی رحمتہ اللعٰلمین خاتم النبین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش کا مہینہ ہے جس کے تصدق میں یہ عیدیں نصیب ہوتی ہیں، آج وہی مبارک دن ہے جس دن خدا نے دنیا پر اپنی سب سے بڑی برکت نازل کی تھی، اور دنیا پر یہ احسان عظیم کیا تھا کہ محمد مصطفےٰ جیسا ہادی اور رہنما ہماری ہدایت کے لئے بھیجا تھا۔

جب سے دنیا قائم ہوئی پروردگار نے ہزاروں لاکھوں نبی اور پیمبر انسانوں کی رہنمائی اور اصلاح کے لئے بھیجے ہمارے نبی محمد مصطفےٰ سب سے آخری نبی ہیں اور آپ کا لقب اسی لئے خاتم النبین ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو پیام آپ نے دنیا کو سنایا وہ ایسا مکمل، ایسا جامع پیام ہے کہ اس کے بعد دنیا کو نہ کسی پیام کی ضرورت ہے نہ کسی پیامبر کی۔

جناب رسول خدا کی تمام صفات حسنہ کا بیان کرنے کی نہ مجھ میں قابلیت ہے اور نہ اس مختصر سی تقریر میں اس کی گنجائش ہے، اس لئے

میں صرف آپ کی ایک صفت کا ذکر کروں گی جو آپ کی سب سے بڑی خصوصیت اور دوسرے سب نبیوں اور ہادیوں میں ممتاز کرنے والی صفت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ آپ نے جہاں ساری دنیا کی اصلاح کی، اور سب کاموں کو سنوارا۔ وہاں سب غلاموں یا ... کمزوروں اور محکوموں کو ان کے پورے پورے حقوق بھی دلوائے۔

آں حضرت کی پیدائش سے پہلے نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا میں جہالت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس زمانے میں بادشاہ رعایا پہ، آقا غلاموں پر، سرمایہ دار مزدوروں پر، سرپرست یتیموں پر، ماں باپ بچوں پر، مرد عورتوں پر۔ غرض ہر زبردست اپنے سے کمزور پر ظلم کرتا تھا اور ان کے حقوق غصب کئے ہوئے تھا اور اس کی نہ کہیں داد تھی نہ فریاد۔

عورت کی حالت اس زمانے میں سب سے ابتر تھی۔ جانوروں کی بھی کچھ حقیقت سمجھی جاتی ہو مگر وہ مخلوق جس کا نام عورت تھا دنیا کی ذلیل ترین مخلوق تھی۔

وہ تمام بڑے بڑے مذاہب جنھوں نے دنیا کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا عورت کو سانپ سے زیادہ خطرناک اور شیطان سے زیادہ گمراہ کرنے والی ہستی سمجھتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ اس سے دور رہکر ہی انسان پاک زندگی بسر کر سکتا ہے۔ یورپ جو آج تہذیب کا دعویدار اور عورت کی آزادی کا ٹھیکیدار مانا جاتا ہے اس وقت وہاں عورت کی حیثیت جانوروں سے بدتر تھی۔ اس کا کام فقط بچوں کو پالنا، مرد کی غلامی کرنا اور اس کے ہر جائز بیجا

حکم پر سر جھکانا تھا۔ عرب کی حالت اس زمانے میں سب سے بدتر تھی۔ وہاں عورت کی حیثیت جائیداد کی سی تھی جو ورثتاً باپ کے بعد بیٹے کو مل جاتی تھی۔ بیٹی کا باپ پر، ماں کا بیٹے پر، بیوی کا شوہر پر، غرض کسی حیثیت میں بھی عورت کا مرد پر کوئی حق نہ تھا۔ وہ اُسے بیچ ڈالے، مار ڈالے، گھر سے نکال دے لیکن وہ اُف تک نہیں کر سکتی تھی۔ بعض قبیلوں میں لڑکی کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالا جاتا تھا یا زندہ زمین میں دفن کر دیتے تھے تاکہ مغرور باپ کو جھکنا نہ پڑے۔ غرض اس وقت عورت کی وہ حالت تھی جسے دیکھ کر زمین کانپتی تھی اور آسمان تھراتا تھا۔ آخر ایک دن رحمت باری جوش میں آئی خدا نے مظلوموں کی آہیں سن لیں اور اپنے پیارے نبی کو تمام دنیا خصوصاً عورتوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ ؎

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت | بڑھا جانبِ بوقبیس ابرِ رحمت
ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت | چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نویدِ مسیحا

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانیوالا | مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنیوالا | وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

اور خدا کے اس برگزیدہ بندے اور آخری نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے دنیا کے تمام کمزوروں اور مظلوموں کی حمایت کا بیڑا اٹھا لیا۔ بڑے سے بڑے بادشاہ کو یہ حق نہ رہا کہ وہ اپنی رعایا پر ظلم یا سختی کر سکے بلکہ وہ رعایا کا خادم ٹھہرایا گیا۔ غلاموں کو خاندان والوں کے برابر درجہ عطا ہوا۔ پیسہ والوں پر زکوٰۃ فرض کی گئی تاکہ کوئی بھوکا اور ننگا نہ رہے، یہ کہہ کر کہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، چھوٹے بڑے کی تفریق مٹا دی گئی۔ ارشاد ہوا کہ "تم سب میں میرے نزدیک وہی سب سے بڑا ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے"۔ یتیم بچوں پر زیادتی کرنا اور ان کا مال غصب کرنا بہت بڑا گناہ اور ناقابلِ معافی قصور قرار دیا گیا۔ جانوروں پر ظلم اور زیادتی کرنے کی ممانعت کی گئی، اور عورت پر تو آں حضرتؐ نے وہ احسانِ عظیم کیا ہے کہ اگر تمام دنیا کی عورتیں مل کر آپ کا شکریہ ادا کریں تو بھی اس کا ایک شمہ ادا نہیں کر سکتیں۔

یورپ اور دوسرے ممالک آج جو حقوق عورتوں کو دلوانے پر زور دے رہے ہیں وہ حقوق رسولِ کریم نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عورتوں کو عطا فرما دیئے تھے۔ بلکہ آج تک دنیا نے زیادہ سے زیادہ جو حقوق عورت کو دیئے ہیں اور دے رہی ہے اور دے گی اس سے زیادہ حق اسلام بہت پہلے عورت کو دے چکا ہے۔

میں یہاں چند بڑے بڑے حقوق کا ترتیب وار ذکر کر دوں گی۔

۱۔ بیٹیوں کو مار ڈالنے کی، جو مذموم رسم عرب میں مروّج تھی وہ بالکل موقوف کر دی گئی اور کسی سرکش سے سرکش باپ کی بھی یہ مجال نہ رہی کہ مار ڈالنا

تو درکنار، کوئی بھی شخص بیٹیوں پر کرسکے۔

۲۔ عورت کو مرد کے ساتھ ساتھ وہ مناسب درجے دیئے گئے جن کی مثال دنیا کا کوئی مذہب پیش نہیں کرسکتا۔ کلام مجید میں آیا ہے کہ "عورتیں مردوں کے لئے زینت ہیں اور مرد عورتوں کے لئے زینت ہے" یعنی خدا کے نزدیک مرد اور عورت کا درجہ برابر ہے اور جس طرح عورت کو مرد کی ضرورت ہے اسی طرح مرد کو بھی عورت کی ضرورت ہے۔ ایک اور آیت ہے کہ "جیسے مردوں کا حق عورتوں پر ہے اسی طرح دستور کے مطابق عورتوں کا حق مردوں پر ہے" اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام عورت کو مرد کی محکوم اس کی دست نگر یا جائیداد نہیں سمجھتا بلکہ اس نے دونوں پر ایک دوسرے کے برابر حقوق رکھے ہیں اور برابر کا شریک ٹھہرایا ہے۔

۳۔ اسلام نے ہر قسم کے فرائض خواہ وہ خدا کے ہوں یا بندوں کے دونوں پر عائد کئے۔ قرآن شریف میں جگہ جگہ بار بار مرد اور عورت کا ساتھ ساتھ ذکر آیا ہے۔ بُرے کام کی سزا اور اچھے کام کی جزا دونوں کے لئے ایک سی ہے۔ اپنی کمائی کے روپیے اور اپنی جائداد پر جس طرح مرد کو حق ہے اسی طرح عورت کو بھی پورا پورا حق اور قبضہ حاصل ہے۔ اولاد پر اگر باپ کا حق ہے تو ماں کا بھی کچھ کم نہیں۔ آں حضرت نے بار بار اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ ماں کا ادب کرو، ماں کی خدمت اور اطاعت کرو اور ماں کا حق باپ سے زیادہ بتایا ہے، کیونکہ ماں جو مصیبتیں بچے کے لئے اٹھاتی ہے باپ نسبتاً بہت کم اٹھاتا ہے۔

۴۔ اسلام نے مرد کو طلاق کا حق ضرور دیا ہے لیکن یہ چیز پسندیدہ نہیں صرف مجبوری کی حالت میں اُسے جائز قرار دیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں عورت کو بھی خلع کا حق حاصل ہے۔

۵۔ شوہر کے انتقال کے بعد نہ صرف عورت کو دوسرے عقد کی اجازت بلکہ تاکید ہے جو عورت دوسرا عقد کرنا چاہے ضرور اور بخوشی کرے۔ ہاں عورت پر جبر کرنے کی یہاں بھی ممانعت ہے اور جو عورت دوسرا عقد کرنا نہیں چاہتی اُسے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

۶۔ عام طور پر دوسرے مذاہب میں عورت کی کوئی ذاتی حیثیت نہیں اور نہ وہ کسی جائداد کی مالک ہو سکتی ہے۔ یہ فخر بھی اسلام کو حاصل ہے کہ جہاں اس نے عورت کی ہر طرح مدد کی وہاں اس کو باپ اور شوہر کی املاک میں حق دار بنایا ہے۔ باپ کی جائداد میں دو حصے حق بیٹے کا اور ایک حصہ بیٹی کا ہے۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ لڑکے اور لڑکی کو برابر حصہ کیوں نہیں دیا گیا، لیکن یہ اعتراض بالکل بے جا ہے۔ مرد بیوی بچوں کا کفیل ٹھہرایا گیا ہے۔ عورت پر اس قسم کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عورت کو مرد سے مہر کی صورت میں روپیہ وصول ہوتا ہے۔ شوہر کی وفات کے بعد اس کی جائداد میں بھی عورت حصہ دار ہے۔ بیٹے کی جائداد میں بھی ماں کا کچھ نہ کچھ حصہ ہے۔ غرض عورت ماں ہو یا بیٹی یا بیوی کسی صورت میں اُسے کس مپرسی کی حالت میں نہیں چھوڑا گیا بلکہ ہر صورت میں اس کا خیال رکھا ہے کہ وہ کسی کی محتاج اور دست نگر نہ رہے۔

بے شک یہ کہا گیا ہے کہ مرد کو عورت پر فوقیت ہے، مگر یہ فوقیت دنیاوی اور جسمانی لحاظ سے دی گئی ہے کیونکہ مرد طاقتور ہے اور بیوی بچوں کی حفاظت کرتا ہے اس لئے وہ ان کا سر دھرا مانا گیا ہے لیکن خدا کے نزدیک جس طرح بادشاہ اور مزدور یکساں ہیں اسی طرح مرد اور عورت میں بھی کوئی فرق نہیں۔ رسولِ خداؐ نے بار بار فرمایا ہے کہ ہر شخص کی عزت اس کے اعمال اور افعال پر منحصر ہے۔

کلام پاک میں بار بار آیا ہے کہ اے مردو اپنی عورتوں سے اچھا برتاؤ کرو ان کے قصوروں سے چشم پوشی کرو اور ان سے کوئی بڑا جرم بھی ہو جائے تو نرمی سے سمجھاؤ، سخت برتاؤ نہ کرو۔ خود رسول اللہ عورتوں کی بے حد عزت اور احترام کرتے تھے۔ تمام ازواج سے آپ کا ایسا بہترین سلوک تھا جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ آپ کی عزیز بیٹی فاطمہ زہرا جب آپ کی خدمت میں آتیں تو آپ تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے اپنی رضاعی ماں کا اس قدر ادب فرماتے تھے کہ جب وہ آپ سے ملنے کے لئے آتیں تو آپ اپنی چادر ان کے لئے بچھا دیتے تھے۔ جو عورتیں آپ کی خدمت میں مسئلے وغیرہ پوچھنے آتیں ان کو بہت عزت سے بٹھاتے اور ان کا ہر طرح خیال فرماتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ "تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جس کا برتاؤ اپنی بیوی کے ساتھ سب سے اچھا ہے"۔ گویا آپ نے مرد کی خوبی کا معیار بیوی کے ساتھ نیک سلوک ٹھہرایا۔ ایمان کی تعریف اس طرح فرمائی کہ "ایمان میں سب سے پکا وہ ہے جو خُلق میں بہت اچھا ہو، اور اپنی بیوی بچوں کے ساتھ بہت

عمدہ برتاؤ کرتا ہو۔" ایک مرتبہ آپ نے فرمایا" بیوہ عورت اور مسکین کی مدد کرنے والا ایسا ہے، جیسا خدا کی راہ میں جہاد کرنے والا یا دن بھر روزہ رکھنے اور تمام رات عبادتِ الٰہی میں بسر کرنے والا۔"

ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا کہ" میرے سب سے بہتر سلوک کا مستحق کون ہے"۔ فرمایا" تیری ماں"۔ اس نے کہا" اس کے بعد"۔ فرمایا" تیری ماں"۔ اس نے پھر پوچھا" اس کے بعد"۔ پھر ارشاد ہوا" تیری ماں" اور چوتھی بار کے پوچھنے پر کہا" تیرا باپ" متواتر تین بار ماں کے لئے اور چوتھی بار باپ کے لئے کہنے کے معنی یہ ہیں کہ ماں کا حق باپ سے تین گنا زیادہ ہے۔

ایک شخص نے آکر کہا کہ مجھ سے ایک بہت بڑا گناہ ہو گیا ہے اس کا کفارہ کس طرح کروں"۔ پوچھا۔ تیری ماں زندہ ہے۔ کہا۔ نہیں۔ پھر پوچھا۔ خالہ ہے۔ اس نے کہا ہے۔ ارشاد ہوا۔ جا اس کی خدمت کر۔ یہی تیرے گناہ کا کفارہ ہے۔

پیمبر اسلام خاتم النبیین، رحمتہ اللعالمین شہنشاہ کونین ہادی دارین محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عورت پر جو احسانِ عظیم کیا ہے اس کو پورا پورا بیان کرنا مجھ جیسی کم علم کے لئے ناممکن ہے۔ میری کیا بساط ہے کہ میں اس رحمتہ اللعالمین کے احسانوں کو گنا سکوں۔ ہاں یہ ضرور کہوں گی کہ ہمارے رسولؐ نے ہم عورتوں کو جو اونچا درجہ عطا کیا تھا وہ مردوں کی خود غرضی کی وجہ سے بہت پست ہو گیا ہے اور جو حقوق ہمیں اسلام نے عطا کئے تھے ان میں سے اکثر انھوں نے غصب کر لئے ہیں۔ اگر آج دنیا

ن کی تعلیم کو سمجھے اور اس پر عمل کرے۔ اگر عورتوں کو معاشرت میں وہ درجہ ملے جس کی وہ مستحق ہیں، انھیں جائز آزادی حاصل ہو، انھیں اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے بچوں کو نیکی، خدا ترسی، صلح اور آشتی کی راہ پر چلنا سکھائیں تو آج جنگ کی وہ آگ جو تمام دنیا کو جلا دینے کے لئے اپنا بھیانک منھ کھولے کھڑی ہے خود بخود بجھ جائے اور امن کا وہ مسئلہ جو توپوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے قیامت تک حل نہیں ہو سکتا۔ خود بخود حل ہو جائے اور دنیا بہشت کا نمونہ بن جائے اور رسول خدا کا یہ قول صرف آسمانی زندگی پر ہی نہیں بلکہ دنیاوی زندگی پر بھی پورا اترے کہ "جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔"

حالؔی کے خطوط

اپنے دوستوں اور عزیزوں سے ملنا جلنا اور باتیں کرنا بھی زندگی کی ایک بڑی نعمت ہے۔ جب کوئی پیارا ہم سے بچھڑ کر دور چلا جاتا ہے تو اس کی یاد ہمیں بہت ستاتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ ہم دور بیٹھے بیٹھے کسی طرح اس سے باتیں کرلیں۔ اِس مقصد کو پورا کرنے کے لئے خط لکھنے کا رواج ہوا۔

عربی کا ایک قول ہے "المکتوبُ نِصفُ المُلاقات" یعنی خط آدھی ملاقات ہے۔ اگر ہم مکتوب الیہ کی صورت بھی دیکھ سکتے تو پوری ملاقات ہوتی مگر صرف باتیں کرنا آدھی ملاقات ہے مگر یہ بھی کچھ کم نہیں، اس کی قدر اس کے دل سے پوچھئے جس کے پاس اپنے کسی بچھڑے ہوئے عزیز یا دوست کا محبت نامہ پہنچتا ہے۔ خط ہمارے دل کی حالت کا آئینہ ہوتا ہے جس طرح ہم گفتگو کے وقت بے بناوٹ باتیں کرتے ہیں اسی طرح خطوں میں بے تکلفی سے صاف صاف اپنے دل کا حال لکھ جاتے ہیں۔ اپنی ہر کتاب یا مضمون لکھتے وقت مصنف کو یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ دوسروں کے ہاتھ میں جانے والی چیز ہے جس کی نقاد پرکھ کرتے ہیں، لہٰذا اسے تھوڑا بہت لوگوں کی رائے اور پسند اور ناپسند کا خیال ضرور کرنا پڑتا ہے اور کچھ نہ کچھ بناوٹ ضرور آجاتی ہے لیکن خط اس سے مختلف چیز ہے۔ اس وقت لکھنے والے کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ لوگ اس کے بارے میں کیا کہیں گے وہ تو اپنے عزیز یا دوست سے بغیر کسی تصنع کے بے تکلف باتیں

کرتا ہے۔ اپنا حال کہتا ہے، اپنے گھر کی مشکلات، اپنا رنج اور اپنے واسطے والوں کے متعلق خیال ظاہر کرتا ہے اور مختلف مسائل پر اپنی سچی اور اصلی رائے لکھ دیتا ہے مولوی عبدالحق صاحب "حالی کے خطوط" کے مقدمے میں فرماتے ہیں "جب انسان اپنے کسی عزیز یا دوست کو خط لکھتا ہے تو وہاں کوئی غیریت باقی نہیں رہتی بلکہ اکثر اوقات دوئی کا پردہ بھی اُٹھ جاتا ہے وہ ہر مسئلے اور ہر شے کے متعلق جیسا اس کا خیال ہوتا ہے صاف صاف اور سچ سچ لکھ دیتا ہے۔ وہ اپنی رائے میں آزاد ہوتا ہے۔ نہ دوسروں سے چوکتا ہے نہ اپنے آپ کو چھوڑتا ہے........ اس وقت نہ اُسے خوف لاحق ہوتا ہے اور نہ نکتہ چینی کا کھٹکا۔ خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ہے جو دلوں کو لبھاتی ہے۔"

آج کل تو ممکن ہے کہ بڑے آدمیوں کو خط لکھتے وقت بھی یہ خیال رہتا ہو کہ شاید کسی وقت ان کے خط منظر عام پر آجائیں مگر کچھ عرصے پہلے تک خط لکھنے والوں کو یہ خیال بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ ان کے نجی خط عام لوگوں کے ہاتھ میں جا سکتے ہیں اور ان پر مولوی صاحب کی لکھی ہوئی تعریف پوری صادق آتی ہے۔

پھر خط بھی ایک قسم کے نہیں ہوتے۔ خط و کتابت بڑی بڑی قسموں میں تین ہیں کاروباری، رسمی اور نجی۔ کاروباری خط تو ہمارے اس موضوع سے خارج ہیں۔ کیونکہ وہ عموماً بالکل خشک اور بے مزہ ہوتے ہیں۔ رہے رسمی خط جو لوگوں کو خاص خاص موقعوں پر مثلاً شادی، غمی وغیرہ پر لکھے جاتے ہیں، ان کے لئے عموماً بندھے ٹکے الفاظ موجود ہیں اور ان خطوں میں بھی کوئی خاص ندرت، یا دلچسپی نہیں ہوتی۔ اب خطوں کی تیسری قسم یعنی نجی خط و کتابت کو لیجئے جو اپنے

بے تکلف دوستوں اور عزیزوں سے ہوتی ہے۔ یہ خط ہیں جن کو پڑھ کر ہمیں لکھنے والے کے خیالات و عادات، احساسات اور جذبات کا اچھی طرح پتہ چل سکتا ہے۔ اور اس کی سیرت اور شخصیت کی اصلی تصویر ہماری نظروں میں پھر جاتی ہے۔

اب سے سو برس پہلے تک ہمارے ملک کی علمی زبان فارسی سمجھی جاتی تھی۔ دفتروں کے سب کام اسی میں ہوتے تھے۔ لوگ شعر کہتے اور سب تصنیف و تالیف فارسی ہی میں کرتے تھے یہاں تک کہ خط و کتابت بھی اسی زبان میں ہوتی تھی۔ اس وقت ہمارے ادب پر تصنّع کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ہر چیز میں بناوٹ، رنگینی، صنائع اور بدائع کو دخل تھا تو بھلا خطوں میں یہ رنگ کیوں نہ پایا جاتا۔ خط میں سر سے پاؤں تک پُر تکلف القاب مسجع فقرے مقفّٰی عبارت رنگین الفاظ کی بھرمار ہوتی تھی اور اصل مطلب بہت کم۔ فارسی میں خط لکھنے کی رسم ترک کر کے اردو میں خط لکھنا سب سے پہلے مرزا غالب نے شروع کیا اور بقول پروفیسر حامد حسین قادری کے "اردو خطوط نویسی کا غالب نے جو طریقہ ایجاد کیا اور اس میں جو جدّتیں پیدا کیں اور ان کو جس التزام اور اہتمام اور کمال کے ساتھ برتا اس میں غالب اول بھی ہیں اور آخر بھی۔"

غالب کے خطوں میں جو تنوع، لطف اور دلفریبی ہے اس کی پوری پوری نقل آج تک کوئی نہ کر سکا۔ غالب کی تقلید میں عام طور پر خط اردو میں لکھنے کا رواج تو ضرور ہو گیا لیکن فارسی میں خط لکھتے لکھتے مدتوں سے جن القاب آداب اور بندھے ٹکے فقروں کی عادت پڑ چکی تھی، وہ اردو میں بھی باقی رہے اور

صرف چند مخصوص لوگوں نے غالبؔ کی سادگی اور بے تکلفی میں اُن کی پیروی کی۔ اُن میں حالیؔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اُردو ادب کی جو خدمت حالیؔ نے کی اور اردو زبان پر حالیؔ کے جو احسانات ہیں اُن سے ہمارے دل میں حالیؔ کا احترام اور ادب پیدا ہوتا ہے لیکن ان کے ذاتی اوصاف، دل سوزی اور ہمدردی، محبّت اور خلوص بے ریائی، اور پاکیزہ اخلاق و اطوار ایسے ہیں جو ہمارے دل میں قدر و عزّت کے ساتھ ساتھ ان کی گہری محبت بھی پیدا کرتے ہیں اور مولانا حالیؔ کی سیرت کی اصلی تصویر نظر آتی ہے۔ حالی کے خطوط میں۔

ان خطوں کے مجموعے میں زیادہ تر خط تو عزیزوں کے نام کے ہیں بہت سے دوستوں اور ہم عصر مشاہیر کے نام بھی ہیں بعض کاروباری ہیں اور کچھ رسمی بھی، اور ان میں سے ہر خط میں حالیؔ کی سیرت کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ضرور پڑتی ہے۔ اور ان کے مطالعہ کا مجموعی طور پر جو اثر دل پر پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ حالیؔ کا دل نہایت وسیع اور محبّت سے لبریز تھا جس میں اپنوں غیروں، دوستوں، دشمنوں، بچوں، عورتوں سب کے لئے گنجائش تھی۔ سب کی محبّت تھی۔ آئیے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں حالیؔ کے خطوں کے کچھ ٹکڑے آپ کو سناؤں۔

مولانا حالیؔ کو بچوں سے بہت محبت تھی۔ ان کے خاندان میں بہت سے بچّے تھے جن سے وہ بے حد محبّت کرتے تھے۔ انھیں ہمیشہ ان کی بہبودی کی فکر رہتی تھی، ان کے خطوں میں جگہ جگہ، بار بار اس کا ثبوت ملتا ہے۔

کہیں بچوں کی تعلیم کا ذکر ہے کہیں صحت پر توجہ دلاتے ہیں۔ اپنے کسی دوست کو خط لکھتے ہیں تو اس کے بچوں کے بارے میں مفید مشورے دیتے ہیں۔ ان کی خیریت پوچھتے ہیں۔ اپنے بچوں کے متعلق اس کی رائے دریافت کرتے ہیں بعض خط جو مولانا نے براہِ راست اپنے نواسوں اور پوتوں کو لکھے ہیں بس پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں کہیں شفقت آمیز ڈانٹ ہے کہیں پیار و محبت سے مشورے دیئے ہیں کہیں بہ پردہ سمجھاتے ہیں اور کہیں کھلی کھلی نصیحتیں کرتے ہیں۔

ایک خط میں اپنے نواسے کو لکھتے ہیں "میری جان اب لکھنے پڑھنے میں ایسی کوشش کرو کہ امتحان کے موقع پر پورا پورا اطمینان رہے" ایک خط میں اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں "میں نے ارادہ کیا ہے (خدا راس لائے) کہ ایک سال فرزند علی کو جس طرح ہو سکے علی گڈھ رکھا جائے اور اس کی تعلیم و تربیت کی کافی نگرانی کی جائے۔ کھیل کود کا تو وہ خود ہی شوقین ہے اور امید ہے کہ مطالعہ کی طرف بھی زیادہ توجہ کرے گا"

بڑھاپے اور کمزوری اور بیماری کا زمانہ ہے۔ لکھنا پڑھنا بہت مشکل ہو گیا ہے مگر دوستوں کے، عزیزوں کے اور بچوں کے خط آتے رہتے ہیں اور وہ کسی نہ کسی طرح جواب دیتے ہیں، اپنے پوتے کو لکھتے ہیں "برخوردار طال العمرہٗ مجھے اب ایک ایک حرف لکھنا دشوار ہو گیا ہے اس وجہ سے تمھیں خط نہیں لکھتا تھا۔ تم بچوں کی طرح خفگی اور ناراضگی کا خیال دل میں نہ لایا کرو۔ میں تم سے ناراض ہوں گا تو راضی کس سے ہوں گا"

مولانا حالی کو اپنے چھوٹے نواسے خواجہ عبدالولی سے خصوصیت کے ساتھ بہت محبت تھی اور اس خصوصیت کی وجہ یہ تھی کہ وہ بچپن ہی سے ایک ہلاک اور

لاعلاج مرض میں مبتلا تھے۔ مولانا نے ان کے علاج اور دواؤں میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔ حکیم، وید، ڈاکٹر ہر ایک کا علاج کیا یہاں تک کہ جو شخص بھی کوئی دوا بتاتا اسے استعمال کراتے۔ بیماری نے مریض کو بہت نازک مزاج بنا دیا تھا اور مولانا ان کی بے حد نازبرداری کیا کرتے تھے اور ان کی جا بے جا ضدیں اٹھاتے تھے اور ان کی ہر خوشی پوری کرنا اپنا فرض سمجھتے۔ ان کے آدھے سے زیادہ خط ایسے ہوں گے جن میں ان بیمار نواسے کا ذکر ضرور ہے۔ مگر باوجود اس قدر محبت اور نازبرداری کے ان کی نازیبا بات پر تنبیہ بھی کرتے تھے۔ ان ہی بیمار نواسے کے نام ایک خط مولانا کا ایسا عمدہ اور نصیحت آموز ہے کہ ہر لڑکے کو پڑھنا چاہئے۔ طوالت کی وجہ سے اس کو پورا نہیں سنا سکتی، صرف چند ٹکڑے کہیں کہیں سے سناتی ہوں۔ جب یہ خط لکھا ہے تو مکتوب الیہ اپنے چچا کے پاس گئے ہوئے تھے۔

"اگر تم کو وہاں کوئی بات ناگوار بھی گزرے تو اسے برداشت کرو اور اپنے مزاج کو ایسا دھیما بناؤ کہ ہر جگہ رہنے کے قابل ہو جاؤ۔ اگر چچا کی طرف سے کوئی سختی بھی دیکھو تو اسے اپنے حق میں اکسیر سمجھو۔ ددھیال اور ننھیال کی تربیت اور پرورش میں یہی تو فرق ہے۔ ننھیال میں ماں کی وجہ سے سب ہاں میں ہاں ملانے والے ہوتے ہیں، کوئی یہ نہیں چاہتا کہ اس کا دل میلا ہو۔۔۔۔ ۔۔۔۔ مگر اس تربیت کا انجام اکثر یہ ہوتا ہے کہ دختری اولاد کی خصلتیں اور عادتیں بگڑ جاتی ہیں ۔۔۔۔۔ ان کا مزاج نازک ہو جاتا ہے۔۔۔۔
بخلاف اس کے ددھیال میں دادا دادی، باپ، چچا کی تربیت بہ نسبت

ننھیال کے سخت ہوتی ہے .... لیکن ان کی سختی اولاد کے حق میں اکسیر ہوتی ہے .... آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے کو متحمل اور بردبار بنا دے تاکہ رنج و راحت دونوں حالتوں میں خوشی رہے"

حالی نے جو خط اپنی پوتی (اہلیہ خواجہ غلام الثقلین مرحوم) کے نام لکھے ہیں وہ اس قدر محبت اور پیار سے بھرے ہیں کہ بے اختیار ہر ایک دل پر اثر کرتے ہیں۔ وہ پہلے پہل وطن سے دور حیدر آباد گئی ہیں، وہاں سے ان کا خط آیا ہے، جواب میں لکھتے ہیں "تمھارا خط عین انتظار میں پہنچا، اس کو پڑھ کر سب کا جی بے انتہا خوش ہوا، اور تمھاری پھوپی کی آنکھوں سے خوشی اور محبت کے جوش میں بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ تم نے اتنی دور جا کر اپنی محبت سب کے دل میں بٹھا دی ہے .... مجھے صاف صاف لکھو، اس ملک کی آب و ہوا کا تم اپنے پر کیا اثر پاتی ہو۔ کیا اچھی بات ہو کہ تم وہاں سے ایسی موٹی ہو کر آؤ کہ یہاں تمھیں کوئی پہچان نہ سکے، اور تم قسمیں کھا کھا کر یقین دلاؤ کہ میں وہی مشتاق فاطمہ ہوں"۔ اسی خط میں آگے چل کر ہدایت کرتے ہیں کہ چلتے وقت جو تم ایک عزیز سے مل کر نہیں گئیں انھیں معذرت کا خط لکھو، بلکہ خط کا مضمون تک بتا دیتے ہیں۔ کسی خط میں پانی کو فلٹر کر کے پینے کی تاکید کرتے ہیں اور فلٹر کرنے کا طریقہ سمجھاتے ہیں۔ تاکید ہے کہ سب کے خطوں کا پابندی سے جواب دیتی رہنا۔ فکر ہے کہ پردیس میں اکیلی گھبرا نہ جائے "گھبرانا ہرگز نہ چاہیئے میں انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد تمہارے واسطے پڑھنے کو کتابیں بھی بھیجوں گا جن سے تمھارا دل بہلے گا۔" اگر اخبار تہذیب نسواں وہاں آتا ہو تو

خیر ورنہ مجھے لکھو میں لاہور لکھ بھیجوں گا کہ میرے نام کا اخبار گلبرگہ بھیجا کریں" خیال ہوتا ہے کہ کہیں گھر کے کام کے ساتھ پڑھنے لکھنے میں اتنی زیادہ محنت نہ کرنے لگے کہ بیمار پڑ جائے" "لکھنے پڑھنے کا شغل بہت اچھا ہے مگر اس میں اتنی محنت بھی نہ کرنا چاہیئے جس سے صحت میں فرق آئے"

کسی کے ساتھ اگر نوکر یا ماما پردیس جاتے ہیں تو ہر خط میں اس کے عزیزوں اور گھر والوں کی خیریت ضرور لکھتے ہیں۔ انھیں بیوی کے کسی خط میں لکھتے ہیں "اللہ دی کے گھر خیر و عافیت ہے، اس کی بھاوج بھتیجا اور بھتیجیاں سب سلام کہتے ہیں" ایک اور خط میں "اللہ دی کو سب کی طرف سے پوچھنا، اس کی بھابی بھتیجا، اور بھتیجیاں سب خیر و عافیت سے ہیں وہ خاطر جمع رکھے" مولانا کے دو ملازم نانوں خاں اور عطاء اللہ بہت پرانے اور چہیتے تھے۔ عطاء اللہ میں یہ صفت بھی تھی کہ وہ بہرا اور لنگڑا اور بد مزاج تھا۔ نانوں خاں اکثر مولانا کے چھوٹے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین کے ساتھ رہا کرتا تھا تقریباً آدھے خط ایسے ہیں جن میں نانوں خاں کا ذکر ضرور ہے "نانوں خاں کو دعا کہنا اور آرام سے رکھنا" "اس کو چاہیئے کہ پانی پت برابر خط لکھتا رہے" "نانوں کے بچے کا حال کل سے معلوم نہیں ہوا۔ وہ شاید کل یا پرسوں آیا تھا، کہتا تھا بچے کا دم چلتا ہے مجھے بھی اس کے بچنے کے کچھ آثار معلوم نہیں ہوتے" غرض سینکڑوں خطوں میں نانوں خاں اور دوسرے ملازموں کا ذکر اس قدر شفقت اور ہمدردی اور خلوص سے ہے کہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کسی نوکر کا ذکر ہے بلکہ خیال ہوتا ہے کہ کسی بہت پیارے عزیز کا ذکر کر رہے ہیں۔

مولوی محمد یحییٰ تنہا صاحب نے اپنی کامیابی کی خبر لکھی ہے، اس کا جواب سُنئیے: "مکرمی۔ جواب طلب خطوں کا انبار لگا ہوا ہے اور جواب لکھنے کی طاقت جواب دے چکی ہے۔ لاچار مختصر جواب دیتا ہوں۔ امتحان پریویس میں پاس ہونے کی مبارک باد دیتا ہوں۔ میرے دو عزیز اسی امتحان میں ناکام رہے ہیں جن کے فیل ہونے کی ہرگز توقع نہ تھی۔ جو رنج اُن کے پاس نہ ہونے سے ہوا تھا وہ آپ کی کامیابی کے مژدہ نے رفع کر دیا......." یہی صاحب اپنی شادی میں بلاتے ہیں۔ عمر اور صحت کی خرابی کا تقاضہ یہ ہے کہ فوراً انکار کر دیں مگر حالی سے یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک دوست کے دل کو ذرا سا ملال بھی پہنچائیں "عزیزی۔ آپ کا محبت نامہ پہنچا۔ اگرچہ میری حالت کہیں آنے جانے کے قابل نہیں مگر آپ کے مہر انگیز اور محبت خیز الفاظ اور جناب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کی تشریف آوری کا مژدہ اور برخوردار غلام الثقلین کی شرکت کی امید مجبور کرتی ہے کہ جس طرح ہو سکے آپ کے حکم کی تعمیل کروں۔"

مولانا حالی کے خطوں کے مطالعہ سے جہاں ان کی رحم دلی، فیاضی فراخ دلی، خوش خُلقی اور محبت و خلوص کا پتہ چلتا ہے وہاں ان کی وسیع معلومات دور اندیشی اور نکتہ سنجی کا بھی حال معلوم ہوتا ہے۔ مولانا حالی کے ہم عصروں میں سے بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھوں نے مولانا کے ادبی اور علمی کارناموں کو سراہا ہے بلکہ بعض تو انھیں اپنا حریف سمجھ کر اُن سے خار کھاتے تھے، لیکن حالی ہمیشہ کھلے دل سے نہ صرف اپنے ہم چشموں کے کاموں کو سراہتے بلکہ مبتدی اور نومشق لوگوں کی بھی دل کھول کر تعریف کرتے اور ان کی ہمت افزائی

کرتے تھے اور ہمیشہ چھوٹوں سے ادب اور تعظیم سے پیش آتے۔ وہ لوگ بھی جو رشک کی وجہ سے حالی کے علمی اور ادبی کمالات کا اعتراف نہیں کرتے تھے حالی کی مضبوط سیرت اور بے مثل اخلاق کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے مولانا کے خطوں سے یہ سب باتیں پڑھنے والوں پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے مولانا کے خطوں کی نسبت کس قدر سچی تُلی رائے دی ہے "خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے سے آپ باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اُسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ نہیں بلکہ وہ اپنا دل نکال کر کاغذ کے ٹکڑے رکھ دیتا ہے اور اگر وہ دل ایسا ہو جو سراسر محبت سے لبریز ہو، جس میں ہمدردی بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کر بھری ہو، جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو تو بتاؤ اس دل کی تراوش کیسی ہوگی؟ اگر تم ایسے دل کی زیارت کرنا چاہتے ہو تو آؤ دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں لپٹا ہوا ہے۔"

حالی ایک خط اپنے بیٹے کو ان کی والدہ کے انتقال پر لکھتے ہیں، کہنے کو وہ ایک رسمی خط ہے مگر اس کا ایک ایک لفظ دل میں کھبا جاتا ہے۔ صرف چند فقرے سنئے "میری جان، والدین کا اولاد کے سامنے گزر جانا والدین کی خوش نصیبی اور اولاد کا قدیم ورثہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہاری والدہ کی جیسی عمدہ زندگی اور عمدہ موت ہوئی ہے اس کی ہر شخص کو تمنا ہونی چاہیئے انھوں نے سعادت مند اولاد چھوڑی ہے .... ایک زمانہ کو اپنا مدّاح اور ثنا خواں چھوڑا ہے .... انھوں نے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی خدمت گزاری سے

مخدومیت کا درجہ حاصل کیا تھا اور آخیر وقت میں جب تک ان کو ہوش رہا خدا کی یاد ان کے ورد زبان رہی جس شخص کی ایسی عمدہ زندگی اور ایسی عمدہ موت ہو اس سے زیادہ اور کون خوش نصیب ہو سکتا ہے اور اس کی اولاد کے لئے اس سے زیادہ اور کیا فخر کی بات ہو سکتی ہے.........."

حالی کے خط اس خیال سے بھی پڑھنے چاہئیں کہ یہ ایک اعلیٰ درجہ کے ادیب کی بے تکلف، سادہ اور سلیس عبارت اور خطوط نویسوں کے لئے بے مثل نمونہ ہے اور اس لیے بھی کہ ان سے اس پاک اور مخلص انسان کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے جس کی مثل دنیا سینکڑوں برس کی گردش کے بعد پیدا کیا کرتی ہے۔

حالی کا یہ شعر جو انھوں نے اپنے استاد غالب کے لئے کہا تھا، خود حالی پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے۔ کہ:—

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا
معنیٔ لفظِ آدمیت تھا

حاؔلی کا اِصْلاحی ادبْ

اگر ہندوستان میں خواجہ الطاف حسین حالی پیدا نہ ہوئے ہوتے تو قوم ایک باکمال شاعر اور ادیب، ایک دل سوز مصلح اور رہنما سے محروم رہتی۔ حالی کی مضبوط اور پاکیزہ سیرت، اُن کی نثر اور ان کی نظم غرض ہر چیز مسلمانان کی قوم کے لئے شمع راہ تھی۔ حالی نہ ہوتے تو شاید ابھی مدت تک ہم اپنی تعلیم، معاشرت، ادب اور شاعری میں وہ ترقی نہ کر سکتے جو پچھلے پچھتر سال میں کی ہے۔ اکبر، صفی، چکبست اور اقبال یہ سب حالی ہی کی جدید شاعری اور مصلحانہ خیالات سے متاثر ہوئے اور جو کچھ انھوں نے کہا وہ گویا حالی ہی کی ذات بابرکات کا فیض ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اہلِ دل نے دیکھا کہ مسلمانوں کی حالت بد سے بدتر ہو چکی ہے۔ پستی اور تنزل نے نہ صرف ہندوستان کی حکومت ان کے ہاتھ سے چھین لی ہے بلکہ ان کے اخلاق اور عام زندگی کو بھی اس قدر بگاڑا ہے کہ اگر فوراً خبر نہ لی گئی تو وہ بہت جلد ایسی حالت کو پہنچ جائیں گے جس کے بعد سنبھلنا ناممکن ہے۔ سرسید مرحوم نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ شدت کے ساتھ اس کو محسوس کیا، عام اخلاقی اصلاح کے علاوہ انھوں نے زیادہ زور زمانۂ حال کی تعلیم حاصل کرنے پر دیا اور عملی طور پر اس کے لئے وہ سب کچھ کیا

جوان کے لبس میں تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو نثر کی طرف بھی توجہ دی جواب تک کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔

حالی کو سرسید سے بہت تعلق تھا، وہ ان کے دلی دوست، شریکِ کار اور سچے معتقد تھے۔ ادبی اسلوب میں بھی سرسید سے سب سے زیادہ متاثر حالی ہی ہوئے ہیں۔ ان کی نثر میں صاف سرسید کی تحریر کی شان جھلکتی ہے اور زورِ بیان ان سے کم سہی، صفائی، سادگی اور گھلاوٹ ان سے کچھ زیادہ ہی ہے حالی کے دل میں ادب سے کچھ کام لینے کا خیال تو پہلے ہی سے موجود تھا۔ خصوصاً شعر کی اصلاح کا جذبہ حالی اور آزاد کے دل میں انگریزی ادب کے مطالعہ نے بہت دن پہلے سے بیدار کر دیا تھا اور انھوں نے اس کام کو شروع بھی کر دیا تھا لیکن سرسید کے اثر سے یہ ہوا کہ حالی نے اپنی جدید شاعری کو تمام تر قوم کی اصلاح کرنے کے لئے وقف کر دیا۔ ان کا بعد کا سب کلام اسی مقصد کے تحت کہا گیا۔

آیئے پہلے ہم آپ سے حالی کی نثر کے متعلق کچھ باتیں کریں۔ حالی کی نثر اپنے رنگ میں پختگی اور سادگی کی ایک خاص شان رکھتی ہے۔ عبارت کی سادگی سلاست اور روانی معنی کی صحت لہجے کی متانت علمی اور ادبی مسائل کو صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں خوبصورتی کے ساتھ بیان کرنا حالی کا حصہ ہے۔ حالی کی نثر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صاف شفاف ندی خس و خاشاک سے پاک آہستہ خرامی کے ساتھ بہہ رہی ہے۔ ان کی نثر کی مشہور تصانیف تین نو سوانح عمریاں ہیں اور ایک مقدمہ شعر و شاعری اور کچھ مضامین جو اب مقالات حالی کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ یادگار غالب کو چھوڑ کر ان کی باقی سب تصانیف میں اصلاحی مقصد پیش نظر ہے

ایک تو انھوں نے سیرت نگاری کی ایک نئی راہ اختیار کی جو نہایت مفید اور پسندیدہ تھی اور بعد میں اردو سیرت نگاری اسی ڈگر پر چلی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہیرو بھی وہ چُنے جو اپنے زمانے کے اخلاق کے معلّم اور مصلح تھے۔ "حیات سعدی"۔ حضرت سعدی شیرازی کی سوانح حیات ہے جنھوں نے شعر و ادب کے باغ کو اخلاق کے آبِ حیات سے سینچا۔ حیات جاوید میں حالی نے سرسیّد کے حالات لکھے ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو غفلت کی گہری نیند سے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ سچ پوچھئے تو یہ کتاب ساری کی ساری اصلاحی ہے۔ خود سرسیّد مرحوم کی تمام زندگی قوم کی فلاح اور بہبودی کی عملی کوشش میں گذری۔ قوم کی ترقی اور اصلاح کا جیسا گہرا جذبہ سرسیّد کے دل میں تھا اس کو حالی نے نہایت خوبی کے ساتھ واضح کر کے دکھایا ہے۔ اگر غور سے اس کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو قومی خدمت کا شوق رکھنے والوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔

ان کی تیسری تصنیف (جو بہت مشہور ہے) مقدمہ شعر و شاعری ہے اس کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ اردو شاعری کے لئے ایک نیا اور وسیع میدان کھول دیا جائے۔ تنقید کی کتابوں میں یہ اپنے رنگ کی پہلی کتاب تھی۔ اس سے پہلے شعر کی تنقید کے معنی یہ تھے کہ اُسے عروض کے مقررہ اصولوں پر جانچ کر دیکھا جائے اور ہر ہر لفظ اور محاورہ پر استادوں کی سند مانگی جائے۔ حالی نے ان سب کو نظر انداز کر کے شعر کے فن کی تنقید ایک نئے ڈھب سے کی۔ انھوں نے شعر کے اصلی اوصاف بتائے اور یہ کہ انھیں کیسے برتنا چاہیئے۔ بہترین شعرا کے کلام سے اچھے برے دونوں قسم کے نمونے دکھائے۔ محاوروں اور روزمرہ

وغیرہ پر بحث کی غرض شعر و شاعری کی حقیقت پر مفصل اور نتیجہ خیز بحث کر کے نہ صرف علمی تنقید کی بنیاد ڈالی بلکہ وہ اردو شاعری کے لئے ایک ایسا دستور العمل کا کام دے سکتا ہے۔

مقالات حالی ہیں ان کے وہ مضامین ہیں جو تہذیب اخلاق وغیرہ کے لئے لکھے گئے تھے۔ ان میں تہذیبی معاشرتی، اخلاقی، تعلیمی، مذہبی اور ادبی مسائل پر خوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور ان کی اصلاح کے طریقے بتلائے ہیں۔

حالی کی ایک اور تصنیف جو زیادہ مشہور تو نہیں لیکن نہایت مفید اور دلچسپ ہے، مجالس النساء ہے۔ اس میں انھوں نے عورتوں کی اصلاح اور بچوں کی عمدہ تربیت کرنے کے طریقے دل نشین انداز میں مفصل طور پر قصے کے پیرائے میں بیان کئے ہیں۔

آئیے اب حالی کی شاعری پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

حالی کی شاعری کی ابتدا بھی غزل ہی سے ہوئی تھی لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ اس زمانے کی عام شاعروں کی طرح پٹی پٹی تک بندی نہیں بلکہ سچے قلبی واردات اور تاثرات کا پاکیزہ طریقے پر اظہار ہے لیکن جب سرسید کے فیض صحبت نے ان کے مذاق شاعری کو اور زیادہ سنوارا تو اس حسن و عشق کے پرانے قصے سے انھیں نفرت ہو گئی اور اپنی جدید شاعری کو قوم کی اصلاح کے لئے وقف کر دیا۔ خود فرماتے ہیں ؎

اے شعر، دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر حیف تجھ پہ ہے جو نہ ہو دل گداز تو

لیکن ان کے شعروں میں دل گدازی کے ساتھ ساتھ دلفریبی بھی کم نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جب فطری شاعر کسی بھی دلی جذبے سے متاثر ہو کر شعر کہے گا تو اس میں شعریت اور دل فریبی ضرور آجائے گی، کیونکہ سچی شاعری کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس میں کسی حقیقی اور دلی جذبہ کا اظہار کیا جائے۔

حالی کے متعدد مثنویاں ہیں لیکن ان کی سب سے زیادہ دل گداز درد و اثر سے لبریز زبان اور بیان کی سادگی اور روانی میں ضرب المثل مثنوی "بیوہ کی مناجات" ہے۔ اس میں ہندوستانی نوجوان بیوہ کے دلی جذبات اور دردناک حالت کی تصویر کھینچ کر سوسائٹی کے ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ بیوہ اپنی حالت بیان کرنے کے بعد خدا سے کہتی ہے۔ سے

جو قسمت نے مجھ کو دکھایا — خوش ناخوش سب میں نے اٹھایا
اپنے لئے کچھ کہہ نہیں سکتی — پر یہ کہے بن رہ نہیں سکتی
میں ہی اکیلی نہیں ہوں دکھیا — پڑی ہے لاکھوں پر یہی بپتا
کوئی نہیں جو غور کرے اب — نبض پہ ان کی ہاتھ دھرے اب
چوٹ نہ جن کے دل پہ لگی ہو — وہ کیا جانیں دل کی لگی کو
بے دردوں سے پڑا ہے پالا — تو ہی ان کا ہے رکھوالا

بیوہ کی مناجات کے علاوہ انہوں نے ایک اور نظم "چپ کی داد" بھی عورتوں کی حالت سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ اس میں انھوں نے عورت کی واقعی حیثیت کو نمایاں کر کے لوگوں کو ان کی خدمات اور ایثار کی طرف متوجہ کیا ہے۔

ان کی تعلیم کی طرف توجہ دلائی ہے اور خود عورتوں کے دل میں احساسِ خودی پیدا کیا ہے۔ کون ہے جس نے یہ شعر نہ سنا ہو ؎

اے ماؤں، بہنوں، بیٹیوں دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمھیں دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے

ذرا دیکھئے گا۔ ہندوستانی شریف عورت کی کیسی سچی تصویر ہے ؎

تم آس ہو بیمار کی، ڈھارس ہو تم لاچار کی
دولت ہو تم نادار کی دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے

اور کیا اس حقیقت سے کوئی انکار کر سکتا ہے کہ ؎

سرکار سے مالک کے جتنے پاک بندے ہیں بڑھے
سب ماؤں کی گودوں کے زینے ہی سے ہیں اوپر چڑھے

اور اس سے بڑھ کر عورت کی عزت، اس کی خدمات کے صلے میں کس نے کی
کی تم نے اس دارالمحن میں جس تحمل سے بسر
زیبا ہے گر کہئے تمھیں فخرِ بنی نوعِ بشر

حالی کی اور بھی بہت سی نظمیں، مثنویاں وغیرہ ہیں جن میں "حبِ وطن" "امید" "اخوان الصفا" "حقوقِ اولاد" "مناظرہ رحم و انصاف" وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر اور قابلِ مطالعہ ہیں، وقت کی قلت کے سبب حالی کے سارے کلام میں سے نمونے پیش نہیں کئے جا سکتے اس لئے صرف "مسدس حالی" میں سے نمونے دیئے جائیں گے۔

"مسدس حالی" یا "مد وجزر اسلام" حالی کی سب سے بہتر سب سے پُر اثر

اور کامیاب نظم ہے۔ یہ کتاب سرسیّد کی تحریک پر لکھی گئی تھی تاکہ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگایا جائے اور ان کی پست حالت سے انھیں آگاہ کرکے ترقی کے میدان میں قدم اٹھانے کا حوصلہ اور جوش پیدا کیا جائے۔ مسدس میں حالی نے سب سے پہلے عرب کے جہالت کے زمانے کی حالت دکھا کر اسلام کے پیام بر ہادی اور رہنما کے ظہور اور ان کی تعلیم کا بیان کیا ہے پھر اس تعلیم نے ان کی امت میں جو نئی روح پھونکی اور جس کی بدولت اس نے دنیا میں بے مثل ترقی کی۔ غرض ان کے عروج کی شاندار تصویر کھینچی جسے دیکھ کر ہر مسلمان کا سر فخر و غرور سے بلند ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بتایا کہ قوم عروج سے زوال کی طرف کیوں اور کس سے آ گئی۔ عام مسلمانوں خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کی انتہائی پستی اور زوال کا وہ مکمل نقشہ کھینچا جسے کوئی اہلِ دل بغیر چشم پرنم اور بغیر بادلِ پُر درد نہیں پڑھ سکتا۔ عروج و زوال کی مکمل تصویر دکھانے کے بعد ناامیدی میں امید کی کرن چمکائی روتوں کے آنسو پونچھے اور انھیں دلاسا دیا کہ ابھی کچھ نہیں گیا اب بھی کھوئی ہوئی عظمت اور گئی ہوئی عزت اسلام کی صحیح تعلیم پر عمل کرکے حاصل کر سکتے ہو۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ حالی اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ سرسیّد نے مسدس پڑھ کر خواہ مخواہ نہیں کہا تھا کہ "میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے ان اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔"

اب کہیں کہیں سے مسدس کے بند سنئے اور بقول سرسیّد اس سچے

حال پر حال لائیے: "رسولِ خدا اور اسلام کی اس بے مثل تعلیم کا حال سنئے جس نے تمام دنیا کی کایا پلٹ دی۔ سہ

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی
اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

حضورؐ نے غافل لوگوں سے فرمایا:-

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق
اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق

لگاؤ تو لو اس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

اسی پر ہمیشہ بھروسا کرو تم
اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم
اسی کی طلب میں مرو گر مرو تم

مبرّا ہے شرکت سے اس کی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کی بڑائی

جتائی انھیں وقت کی قدر و قیمت
دلائی انھیں کام کی حرص و رغبت
کہا چھوڑ دیں گے سب آخر رفاقت
ہوں فرزند و زن اس میں یا مال و دولت

نہ چھوڑے گا پر ساتھ ہرگز تمہارا
بھلائی میں جو وقت تم نے گزارا

کہیں دور رحمت سے سب اہلِ دنیا
یہ کہہ کر گیا علم پہ اُن کو شیدا
ہے تعلیم کا یا سوا جن میں چرچا
مگر دھیان ہے جن کو ہر دم خدا کا
انھیں کے لئے یاں ہے نعمت خدا کی
انھیں پر ہے واں جا کے شفقت خدا کی

حالی نے اسلامی تمدن اور معیشت کے اصول اور اسلام کی سچی اور اصلی تعلیم کو مسدس میں اس خوبی سے دکھایا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اس کا مختصر ہی سا خاکہ نمونے کے طور پر پیش کروں، مگر چونکہ یہ ممکن نہیں اس لئے آپ سے کہوں گی کہ اگر آپ اسلام کی روح کو سمجھنا چاہتے ہیں تو مسدس حالی ضرور پڑھئے رسول اللہ نے اپنے بعد جو اُمت چھوڑی وہ کیسی تھی؟ اس کے صرف چند وصف سنیئے سہ

سب اسلام کے حکم بردار بندے
سب اسلامیوں کے مددگار بندے
خدا اور نبی کے وفادار بندے
یتیموں کے رانڈوں کے غمخوار بندے
ہر آفت میں سینہ سپر کرنے والے
فقط ایک اللہ سے ڈرنے والے

اور جب اس حق پرست قوم نے دنیا پر جہالت کا اندھیرا چھایا ہوا دیکھا تو

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اٹھی
پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دور دور اس کی پہنچی
جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

غرض ان امتیوں نے ساری دنیا میں اجالا کر دیا اور اخوت، مساوات عدل، انصاف، سرفروشی، جانبازی، حق پرستی اور خدمتِ خلق کا وہ نمونہ دکھایا کہ ساری دنیا حیرت میں رہ گئی لیکن ہر کمالے را زوالے ؎

گیا چھوٹ سر رشتہ دینِ ہُدیٰ کا   یہ گدلا ہوا جب کہ چشمہ صفا کا
تو پورا ہوا عہد تھا جو خدا کا   رہا سر پہ باقی نہ سایہ ہُما کا

کہ ہم نے بگاڑا نہیں کوئی اب تک
وہ بگڑا نہیں آپ دنیا میں جب تک

پھر تو حالی نے تمام مسلمانوں خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کی انیسویں صدی کی حالت اس طرح دکھائی جو سر ابھی فخر سے اونچے تھے شرم اور رنج سے جھک جاتے ہیں اس کو پڑھ کر آنکھیں ہی نہیں دل بھی روتا ہے۔ پھر بتاتے ہیں کہ یہ زوال یہ پستی کیوں آئی ؎

کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا   یہ پہلا سبق تھا کتابِ خدا کا
خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا   وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا

یہی ہے عبادت یہی دین وایماں!
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

کہ ہیں سب مسلمان باہم برادر   اگر بھولتے ہم نہ قولِ پیمبر
معین اس کا ہے خود خداوندِ داور   برادر ہے جب تک برادر کا یاور

تو آتی نہ بیڑے پہ اپنے تباہی
فقیری میں بھی کرتے ہم بادشاہی

کیا حالی نے غلط کہا کہ کسی قوم کے زوال کا سبب اس کی آپس کی پھوٹ ہے۔ ہائے وہی قوم :-

جو تفرقے اقوام کے آئی تھی مٹانے اس قوم میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے

آخر میں جب مسلمانوں کو ان کی انتہائی پست حالت دکھا کر ان کے دلوں کو پگھلا چکے تو نا امیدی میں اُمید کی کرن چمکائی اور دلاسا دیا کہ مایوس نہ ہو :-

بس اے ناامیدی نہ یوں دل دکھا تو جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو
ذرا ناامیدوں کی ڈھارس بندھا تو فسردہ دلوں کے دل آخر بڑھا تو

ترے دم سے مُردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سرسبز کی ہیں

کہتے ہیں ابھی تم میں کچھ جوہر بے بہا پوشیدہ ہیں :-

بہت ہم میں اور تم میں جوہر ہیں مخفی خبر کچھ نہ ہم کو نہ تم کو ہے جن کی
اگر جیتے جی کچھ نہ ان کی خبر لی تو ہو جائیں گے مل کے مٹی میں مٹی

یہ جوہر ہیں تم میں امانت خدا کی
مبادا تلف ہو ودیعت خدا کی

اور سب سے آخر میں کس الحاح و زاری سے خدا سے دعا کرتے ہیں

الٰہی بحقِ رسولِ تہامی ہر اک فرد انسان کا تھا جو حامی
جسے دور و نزدیک تھے سب گرامی برابر تھے کالے و زنگی و شامی

شریروں کو ساتھ اپنے جس نے نبھایا
بروں کا ہمیشہ بھلا جس نے چاہا

طفیل اُس کا اور اس کی عترت کا یا رب
پکڑ ہاتھ جلد اس کی امت کا یا رب
اک ابر اس پہ بھیج اپنی رحمت کا یا رب
غبار اس سے جو دھوئے ذلت کا یا رب

کہ ملت کو ہے ننگ ہستی سے اُس کی
ہوا پست اسلام پستی سے اس کی

انھیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے
ذرا ان کی آنکھوں سے پردا اٹھا دے
کمیں گاہ بازیِ دوراں دکھا دے
جو ہونا ہے کل آج ان کو دکھا دے

چھتیں پاٹ لیں تا کہ باراں سے پہلے
سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے

عام طور پر جو اصلاحی مقصد پیشِ نظر رکھتے ہیں ان کی شاعری پھیکی اور بے جان ہوتی ہے لیکن حالی کا کلام پڑھئیے باوجود اصلاحی ہونے کے اس میں شاعری کی اصلی روح پائی جاتی ہے۔ مسدس کی اصلی مقبولیت کی وجہ محض اس کا اصلاحی پہلو نہیں بلکہ وہ کمال شاعری ہے جو اس کے ایک ایک شعر میں پوشیدہ ہے تسلسل، روانی، ترنم، اصلیت، سادگی، جوش، سچائی اور درد و سوز کیا ہے جو اس میں نہیں۔ واقعی خشک اور اصلاحی مضامین میں شگفتگی، نصیحت میں شعریت پیدا کرنا فارسی میں سعدی کا اور اردو میں حالی کا حق تھا اس لئے سعدیِ ہند کا لقب جو حالی کو دیا گیا بالکل بجا ہے ؎

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

———— ✲(✲)✲ ————

اوروں کی باتیں

مصطفیٰ کمال پاشا نے عورتوں کیلئے کیا کیا؟

تاریخ جاننے والے جانتے ہیں کہ اسلام سے پہلے دنیا کے اکثر ملکوں میں عورت کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جاتا تھا۔ ابھی تھوڑے ہی دن کی بات ہے کہ اُس یورپ میں بھی جو آج تہذیب اور آزادی کا علم بردار بنا ہوا ہے عورتیں جانوروں سے بدتر سمجھی جاتی تھیں۔ اس وقت سب سے بدتر حالت عرب کی تھی، جہالت اور استبداد کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ یوں تو سبھی کمزوروں پر ظلم ہوتا تھا مگر سب سے زیادہ وحشیانہ برتاؤ عورت کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں وہاں پیغمبر اسلام محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم پیدا ہوئے۔ آپ کی ذاتِ مبارک یوں تو سارے عالم کے لئے رحمت تھی مگر آپ کا سب سے بڑا احسان عورتوں پر ہے جن کو انھوں نے انسانیت کے سب حقوق عطا فرمائے اور عورت مرد کو ایک درجے پر لاکر کھڑا کر دیا۔ آپ نے بتایا کہ "عورت کی عزت کرنا چاہئے۔ فرمایا" جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے"۔ "اے مردوں تم عورتوں کا لباس ہو اور عورتیں تمھارا لباس ہیں" یہ ہر طرح عورت اور مرد میں مساوات قایم کی اور وہ حقوق عورت کو عطا فرما دیئے جنھیں آج تیرہ سو برس بعد مغرب نے مانا ہے۔

اس زمانے میں بھی جب کہ تقریباً تمام دنیا میں عورت کی حالت خراب تھی ترکی کی عورتیں آزاد تھیں اور انھیں ہر قسم کے حقوق حاصل تھے لیکن

جب ترکوں نے ایشیائے کوچک کو فتح کیا جو پہلے بازنطینی حکومت میں تھا، تو وہ کچھ تو وہاں کی معاشرت سے متاثر ہوئے اور کچھ اپنی ہمسایہ سلطنت ایران کی معاشرت سے نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے وہ سب حقوق جو اسلام اور انسانیت نے عورت کو عطا کئے ہیں غصب کر لیئے اور عورتیں محض زینتِ خانہ ہو کر رہ گئیں۔

ترکوں کی عورتوں کی حالت کچھ مدت پہلے اس سے بھی زیادہ خراب تھی جو آج ہندوستانی مسلمان عورت کی ہے۔ انھیں گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی، تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا، ان کی شادی بغیر مرضی جہاں سرپرست چاہتا کر دیتا۔ انھیں خلع کا حق حاصل نہیں تھا، مردوں کی بے جا اطاعت ان کا فرض تھا اور وہ ان کے سب مظالم برداشت کرنے پر مجبور تھیں۔ جائیداد میں انھیں کوئی حق نہیں ملتا تھا۔ غرض نہایت خراب حالت تھی لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ حالت زیادہ تر شہروں میں تھی۔ گاؤں کی عورتوں کو اب بھی کچھ حقوق حاصل تھے اور وہ مردوں کے دوش بدوش کام کرتی تھیں۔

ترکی عورتوں کو ترقی کا موقع اصل میں ۱۹۰۸ء میں ملا۔ آئینی انقلاب کے بانی نوجوان ترکوں نے اور خواہ کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن یہ ضرور کیا کہ عورتوں کی تعلیم پر زور دے کر ان میں اپنے حقوق کا احساس پیدا کر دیا اور عورتوں نے پردے ہی میں تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ ان کے لئے نہ صرف اسکول بلکہ اکثر جگہ کالج بھی قایم کئے گئے اور ترکی عورتیں تعلیم پا کر خواب غفلت سے بیدار ہونے لگیں اور انھیں احساس ہوا۔ کہ کمزور کا زبردست کے بے جا

مظالم برداشت کرنا مذہب اور انسانیت کے خلاف ہے۔ انھوں نے جگہ جگہ انجمنیں قایم کیں۔ جنگ بلقان کے زمانے میں زخمیوں کی تیمارداری کی اور یتیم بچوں کی تعلیم اور بیوہ عورتوں کے دستکاری کا انتظام کرنے میں تو انھوں نے کمال ہی کر دیا۔

جنگ عظیم کے زمانے میں جو کارِ نمایاں ترکی عورتوں نے انجام دیا اس کی تفصیل کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ اس کے بعد انقلاب کے زمانے میں ترکی عورتوں نے وہ کر دکھایا جو واقعی ایک آزاد قوم کی آزاد عورت ہی کرسکتی ہے۔ تمام قوم کے جوان بوڑھے اور نوعمر لڑکے تک جنگ کے میدان میں تھے۔ ملک کے کاروبار کی ذمہ داری زیادہ تر عورتوں پر تھی۔ انھوں نے زخمیوں کی تیمارداری کی ہتھیار ایک جگہ سے دوسری جگہ کندھوں پر رکھ کر پہنچائے۔ فوجوں کے لئے رسد کا انتظام کیا۔ بچوں کی پرورش اور گھر کی دیکھ بھال تو ان کا اپنا کام تھا ہی اس کے علاوہ کاشتکاری اور تجارت کا بوجھ بھی انھوں نے اپنے سر لے لیا تھا۔

اور اس ایثار کو دیکھئے کہ ترکی عورت نے ان سب قربانیوں کا مردوں سے کوئی صلہ نہیں مانگا۔ وہ جانتی تھی کہ غلامی کتنی بڑی لعنت ہے، اور چونکہ وہ عرصۂ دراز تک مرد کی غلامی کا مزا چکھ چکی تھیں اس لئے اُسے اپنے ملک کی آزادی اور بھی زیادہ پیاری ہوگئی تھی۔ اس نے بغیر کسی ذاتی خواہش کے ملک کو آزاد کرانے میں جان توڑ کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوئی۔ اگر ترکی عورتیں مردوں کے دوش بدوش اپنے دشمنوں کا مقابلہ نہ کرتیں تو ترکی کسی طرح بھی آزاد

نہیں رہ سکتا تھا۔

عورتوں کی خدمات اور قربانیوں کو دیکھ کر مردوں کو خود بخود یہ احساس پیدا ہوا کہ انھیں ہر قسم کے سیاسی اور معاشرتی حقوق ملنے چاہئیں۔ اور یہ مصطفےٰ کمال پاشا کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ترکی عورتوں کو چند سال کے اندر وہ سب حقوق حاصل ہو گئے جو یورپ کی عورتوں کو ایک صدی کی کش مکش کے بعد بھی پورے طور پر نہیں مل سکے۔

مصطفےٰ کمال نے عورتوں کے لئے جو کچھ کیا وہ حقیقت میں ایک فرض کی ادائے گی تھی، انھیں جو عظمت حاصل ہوئی وہ ایک عورت ہی کی بدولت ہوئی۔ پانچ سال کی عمر میں ان کے سر سے باپ کا سایا اٹھ گیا تھا لیکن ان کی شفیق ماں نے اپنے اس نونہال کو ایسی بے مثل تربیت کی کہ ایک یتیم لڑکا صدر جمہوریہ ترکی اور آتاترک بن گیا۔

زمانۂ انقلاب میں ترکی عورتوں کی قربانیوں سے یوں تو تمام ترکی متاثر ہوا لیکن اس کا سب سے زیادہ احساس مصطفےٰ کمال پاشا کو ہوا اور انھوں نے ترکی عورتوں کی قربانیوں کا ایسا صلہ دیا جو ان کی خدمات کے شایان شان تھا

مصطفےٰ کمال عورتوں کی تعلیم کے بہت بڑے حامی تھے۔ ایک مرتبہ (۱۹۲۳ء میں) انھوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا "اگر کوئی قوم صرف مردوں کو تعلیم دیتی ہے تو وہ اپنے آدھے حصّے کو کمزور کرتی ہے۔ اگر ہمیں ترقی کرنی ہے تو عورتوں کی تعلیم و تربیت کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہئے" عورتوں کی زندگی کا مقصد اچھی ماں بننا ہے۔ قوم کی ترقی کا راز ماؤں کی تعلیم میں ہے

ہماری قوم نے طے کر لیا ہے کہ ہم مضبوط بنیں اور اس کے لئے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو تعلیم دیں۔ ان کو ہر علم و فن میں دخل ہوگا اور زندگی کے ہر شعبے میں مرد عورت پہلو بہ پہلو کام کریں گے اور ہر کام میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔"

کمال اتاترک نے عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے گئے۔ ہر ترکی مرد اور ہر ترکی عورت کے لئے تعلیم لازمی کر دی گئی اور آج ترکی میں جاہل عورت کا ملنا دشوار ہے۔ وہاں قانون کی نظر میں عورت اور مرد کا درجہ برابر ہے۔ عورت کو خلع کا حق حاصل ہے۔ اُسے جائداد میں مردوں کے برابر حصہ ملتا ہے۔ اُسے ووٹ کا حق دے دیا گیا ہے اور وہ پارلیمنٹ کی ممبر بھی بن سکتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم وزیر کابینہ کے عہدے پر بھی فائز رہ چکی ہیں۔

ہر قسم کی سرکاری ملازمتوں کے دروازے عورتوں کے لئے کھلے ہیں خصوصاً تعلیم کے محکمے میں انھیں خاص طور پر جگہ دی گئی ہے۔ عدالتوں، اسپتالوں، بنکوں، دکانوں، کارخانوں میں غرض ہر جگہ عورتیں کام کرتی نظر آتی ہیں اور سیاسی، قانونی، معاشی، اقتصادی حیثیت سے ہر جگہ مردوں کے برابر حصہ رکھتی ہیں

| مصطفےٰ کمال پاشا نے یورپ کے اثر سے متاثر ہو کر ترکی میں سوئٹزر لینڈ کا قانون نافذ کیا جس میں بعض باتیں شرع اسلام سے مختلف ہیں۔ مثلاً مرد کو ایک سے زیادہ شادی کی ممانعت، مرد عورت کا وراثت میں برابر کا حق

دینا اور قانونی نکاح کا طریق رائج کرنا۔ ان چیزوں سے مسلمان عام طور پر ناراض ہیں، لیکن یہ بات جو عوام میں مشہور ہے کہ مصطفیٰ کمال نے سب ترکی عورتوں کو مجبور کر کے زبردستی پردہ ترک کرایا ہے بالکل غلط ہے۔ اگرچہ وہ خود پردے کے مخالف تھے اور انھوں نے اپنی بہت سی تقریروں میں اپنا خیال ظاہر بھی کیا لیکن پردہ چھوڑنے کی اصل وجہ خود عورتوں کی آزاد پسند طبیعت تھی، وہ مغرب سے متاثر ہو رہی تھیں اور انھوں نے مجبور ہو کر نہیں بلکہ اپنی خوشی سے پردے کو چھوڑا ہے۔ لیکن اب بھی کہیں کہیں کوئی بوڑھی ترکی عورت برقعہ اوڑھے نظر آجاتی ہے۔

باوجود آزادی کے علم بردار ہونے اور عورتوں کو مردوں کے برابر ہر کام میں شریک کرنے کے مصطفیٰ کمال ہمیشہ اس پر زور دیتے رہے کہ عورت کا اعلیٰ مقصد اچھی ماں بننا ہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب تک بچے اچھی ماؤں کی گود میں پرورش نہیں پائیں گے وہ کبھی سچے دیندار اور محب قوم نہیں ہو سکتے۔

انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا "تہذیب و تمدن کے متعلق ایک بات پر خاص طور پر زور دینا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ قوموں کی قوت اور ترقی کی بنیاد گھریلو زندگی ہے۔ اگر گھر میں امن و سکون نہ ہوگا تو سارا سماجی، معاشی اور سیاسی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔"

کتنا سچا اور نپا تلا۔ قابلِ قدر قول ہے؟

خالدہ ادیب خانم

جامعہ ملیہ ہال آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، اوپر گیلری میں ہم چند عورتیں ہمہ تن انتظار تھیں کہ پہلو کے دروازے سے خالدہ خانم، ڈاکٹر انصاری مرحوم اور چند دوسرے معززین کے ساتھ ہال میں داخل ہوئیں وہ سیاہ لباس پہنے ہوئے تھیں جس میں سے ان کا چہرہ چاند کی طرح چمکتا ہوا نظر آرہا تھا اور وہ لوگوں کے پُرجوش خیرمقدم کا سر جھکا کر اعتراف کر رہی تھیں۔ اس طرح پہلی مرتبہ میں نے اس شہرہ آفاق خاتون کی زیارت کی دوسری مرتبہ ایک پارٹی میں ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہر نئی آنے والی بی بی سے کھڑے ہو کر تپاک سے ہاتھ ملاتیں اور باتیں کرتیں۔ بچوں کو گود میں لے کر پیار کرتیں اور ان سے باتیں کرنے کی کوشش بھی کرتی تھیں۔ ان کی بڑی بڑی دلکش آنکھیں اور پُروقار چہرہ دیکھ کر مقابل کی نظر خود بخود جھک جاتی اور دیکھتے ہی یہ احساس ہوتا کہ واقعی اس خاتون کی شخصیت مردہ قوم کو زندہ کر سکتی ہے۔

خالدہ خانم ۱۸۸۵ء میں قسطنطنیہ میں پیدا ہوئیں۔ وہ چھوٹی ہی سی تھیں کہ ان کے والدین میں نااتفاقی ہوگئی اور ان کی والدہ اس صدمہ سے جاں بر نہ ہو سکیں۔ خالدہ خانم کی زندگی پر اس واقعہ نے بڑا گہرا اثر ڈالا

ان کی نظروں میں ماں کی غمگین صورت پھرا کرتی اور ان پر ایک افسردگی سی چھائی
رہتی جس نے انھیں بچپن سے سنجیدہ، حساس اور دردمند بنا دیا۔ ان کی ابتدائی
تعلیم گھر ہی پر ہوئی اس کے بعد ان کے والد ادیب بے نے انھیں عام رواج
کے خلاف اسکول میں داخل کر دیا ۱۹۰۱ء میں خالدہ خانم نے بی۔ اے کی
ڈگری لی اور پروفیسر صالح ذکی بے سے شادی کر لی لیکن باوجود اس کے
کہ دونوں کی رضامندی سے شادی ہوئی تھی ان کے تعلقات خوشگوار
نہ رہ سکے کیونکہ دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ آخر ۹ سال
بعد دونوں میں علیحدگی ہو گئی اس صدمے سے خالدہ خانم بہت دنوں تک
بیمار رہیں۔ کچھ مدت بعد انھوں نے عدنان بے سے نکاح کر لیا جو "ہلال
احمر" کے سکریٹری تھے اور دونوں میاں بیوی یک دل ہو کر ملک و قوم
کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔ ان کے دو بیٹے ہوئے جو اب خود صاحب اولاد ہیں

خالدہ خانم کو قدرت نے بہت سی اور صفات کے ساتھ ساتھ ایک پاکیزہ دل
اور ستھرا ادبی ذوق بھی عنایت کیا تھا۔ انھوں نے چھوٹی ہی سی عمر سے تصنیف و
تالیف کا کام شروع کر دیا تھا۔ ان کا پہلا ہی ترجمہ "ایک امریکن ماں اپنے گھر میں"
بہت مقبول ہوا اور سلطنت نے بھی اس کے اعتراف میں انھیں "تمغۂ اعزازی"
عطا کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اور بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے ایک کتاب
"نیا توران" تو اس قدر مقبول ہوئی کہ ملک کے اس سرے سے اُس سرے
تک اس کی شہرت پھیل گئی۔ ان کی اکثر کتابوں کے ترجمے غیر زبانوں میں ہو گئے
ہیں۔

خالدہ خانم ابتدا سے "نوجوان ترکوں" کی تحریک میں شامل تھیں ایک اخبار کے نسوانی حصے کی ادارت خالدہ خانم کے سپرد تھی اور اس فرض کو خالدہ خانم نے بڑی کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔ ان کے مضامین جن میں متانت سنجیدگی صداقت اور ان سب سے زیادہ خلوص ہوتا تھا۔ بے انتہا مقبول ہوئے اور ترکی عورتوں پر ان کا اثر روز بروز بڑھنے لگا۔

کچھ عرصے بعد ملک میں "نوجوان ترکوں" کی بڑے زور شور سے مخالفت ہونے لگی، ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور اسی لپیٹ میں خالدہ خانم بھی آگئیں۔ انھیں اپنی جان بچانے کے لئے گھر بار چھوڑ کر یورپ میں پناہ لینی پڑی مگر چند مہینے بعد وہ پھر واپس آگئیں کیونکہ ملک میں پھر امن قائم ہو گیا تھا۔

محکمہ تعلیم کے ایک افسر نے ان سے تعلیم نسواں کے متعلق ایک مفصل رپورٹ لکھنے کی درخواست کی اور خالدہ خانم کو تعلیم نسواں کے کام میں مشغول ہونا پڑا اور اس سلسلے میں انھوں نے کالج میں فلسفہ تاریخ اور نفسیات کے درس بھی دیئے اور ان کی ساتھی نفیسہ خانم اور انکے انہماک اور کوششوں سے اسکول کالج کے درجے تک پہنچ گیا اور دور دور اس کی شہرت پھیل گئی گو کچھ عرصے بعد ان سے اور وزیر تعلیم سے کچھ امور میں اختلاف پیدا ہو گیا اور انھیں اس کام کو چھوڑنا پڑا۔

اسی زمانے میں جنگ عظیم شروع ہوئی اور ترک جنگ میں شریک ہونے پر مجبور ہو گئے جس سے ملک کی ترقی اور اصلاح کا کام رک گیا۔ اب خالدہ خانم کا دائرہ عمل زیادہ وسیع ہونے لگا۔ مضمون نگاری جو انھوں نے شروع شروع

کی تھی، اب اُس کا واحد مقصد اپنے ملک، اپنی قوم اور اپنی جنس کی خدمت ہو گیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ترکی عورتوں کی تعلیم تربیت کے لئے انجمنیں قایم کیں، ایک اسپتال کھولا جس میں زخمیوں کی تیمارداری کرنا سکھایا جاتا تھا۔ غرض اس زمانے میں انھوں نے جان توڑ کوشش کر کے عورتوں کے اندر بیداری اور آزادی کی ایک نئی روح پھونک دی۔

لیکن خالدہ خانم کے اصلی جوہر اس وقت کھلے جب کہ جنگِ عظیم کے بعد ترکی پر غیر ملکیوں کا قبضہ ہو گیا۔ اب خالدہ خانم کی تقریر و تحریر میں ایک اور ہی شان پیدا ہو گئی۔ ترک قوم ہمیشہ سے آزاد ہے وہ سب کچھ برداشت کر سکتی ہے پر غلامی منظور نہیں کر سکتی۔ خالدہ خانم کے مضامین اب واقعی ترکوں کی زبان کا کام دینے لگے اور ان کی جوش بھری تقریروں نے ترکوں کی رگِ حمیت کو چھیڑ دیا ان کے خون میں جوش اور ان کے دل میں آزادی کی سچی لگن پیدا کر دی۔ پہلے وہ تھوڑے سے آدمیوں کے سامنے تقریر کیا کرتی تھیں، اب ہزاروں لاکھوں کے مجمع میں ایسی بے تکان تقریریں کیں کہ لوگ حیرت میں رہ گئے اور ان کے پیغام کو پیغامِ حق سمجھا جانے لگا اور اپنے ملک کے لئے ترک لڑنے مرنے کو تیار ہو گئے اور انھوں نے مٹھی بھر لوگوں سے لاتعداد فوجوں کا مقابلہ کیا اور آزادی میں کامیابی حاصل کی۔

خالدہ خانم نے صرف تحریر و تقریر ہی سے کام نہیں لیا بلکہ اور بہت سی اہم عملی خدمات بھی انجام دیں۔ انھوں نے عورتوں کو اس قابل بنا دیا کہ مردوں کے میدانِ جنگ میں ہونے کی صورت میں تمام معاشرتی کام اپنے ذمہ لیں

خالدہ خانم نے مردوں کے دوش بدوش میدان جنگ میں بہادری کے جوہر بھی دکھائے اور جب بہ مجبوری ملک سے نکل جانا پڑا تو غیر ملک میں بھی، اور جواں مرد ترکوں مثلاً مصطفےٰ کمال پاشا اور رفعت بے وغیرہ کے ساتھ مل کر ترکی کی آزادی کی کوشش میں مشغول رہیں۔ ایک جگہ کی خبریں دوسری جگہ پہنچانا جو حد درجہ نازک اہم اور خطرناک کام ہے اس شیر دل، جواں مرد عورت نے اکیلے انجام دیا۔

جنگ آزادی میں ترکی عورتوں کی خدمات کا ذکر خود خالدہ خانم کی زبان سے سنیئے جو انھوں نے جامعہ ملیہ کے ایک لیکچر میں کیا تھا" اس قومی مصیبت نے جس کی انتہا یہ تھی کہ ۱۹۱۸ء میں استنبول پر غیر ملکیوں کا قبضہ ہوگیا، ترکی عورتوں کی آنکھیں کھول دیں انھیں اب معلوم ہوا کہ وہ اپنے ملک کو کس قدر عزیز رکھتی ہیں یہ حالت دیکھ کر انھیں جس قدر صدمہ ہوا اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ جنگ بلقان کے زمانے سے وہ دل وجان سے ملک وقوم کی خدمت میں مصروف تھیں اب انھیں یہ نظر آتا تھا کہ ان کی ساری قربانیاں رائگاں گئیں۔ .... انھیں احساس تھا کہ ملک عورت کے لئے گھر کی طرح ہے .... عورتوں کا فرض ہے جب تک ان کے دم میں دم ہے اس گھر کی حفاظت کریں۔ .... صلح کی تمنا جس بے تابی سے عورتوں کو ہوتی ہے مردوں کو کبھی نہیں ہوسکتی اس لئے کہ گھر بار کی سلامتی اور بچوں کی راحت اور مسرت امن اور صلح پر منحصر ہے۔ مگر ترکی عورتیں جانتی تھیں کہ اس وقت اگر جان توڑ آخری مقابلہ نہ کیا جائے تو نہ گھر باقی رہے گا نہ ملک پھر کیا تعجب ہے کہ ہم یہ سنتے ہیں کہ سمرنا کی پہاڑیوں اور سلیشیا کے میدان میں عورتیں خود لڑتی تھیں یا لڑنے والوں کی مدد کرتی تھیں .... ہر شہر اور ہر قصبہ میں

عورتوں نے "تحفظ حقوق قومی" کی انجمن قایم کر رکھی تھیں جو "ہلال احمر" کے کام اور دوسرے کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھیں مگر سب سے زیادہ اہم خدمت وہ تھی جو کسانوں کی عورتوں نے انجام دی۔ اب کی بار پھر انھوں نے کھیتوں کو جوتنے اور بونے اور کل ضرورت کے سامان مہیا کرنے کا کام بغیر مردوں کی مدد کے انجام دیا۔ پھر وہ اس ہیئت سے کہ پاؤں میں جوتے اور بدن پر کافی کپڑے تک نہ تھے سامانِ جنگ پیٹھ پر لاد کر یا بیل گاڑیوں میں بھر کر اس سرے سے اُس سرے تک ملک میں پھرتی تھیں ...... میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ بار برداری کی گیارہ گاڑیاں چلی جا رہی ہیں جن کی ہنکانے والی سب کی سب عورتیں ہیں۔ ان کی افسر فاطمہ ایک ستر برس کی عورت تیر کی طرح سیدھی، فولاد کی طرح مضبوط تھی ...... یہ سب عورتیں خاموشی اور وقار کے ساتھ اپنی گاڑیوں کو لئے نہ صرف کیچڑ اور دلدل بلکہ گولیوں کی بوچھاڑ میں بڑھتی چلی جاتی تھیں۔"

اور کیا مجھے یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ ترکی عورتوں میں اس قومی ہمدردی، ملکی خدمت، آزادی کی لگن اور قوتِ عمل کی روح خالدہ خانم ہی کی پھونکی ہوئی تھی

ڈاکٹر انصاری مرحوم کے چند فقرے جو انھوں نے خالدہ خانم سے متعلق لکھے تھے آپ کو سناتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے چند لفظوں میں ان کی سیرت اور کردار کا مکمل نقشہ کھینچ دیا ہے۔

"انھوں نے ناول نویس اور ماہرِ عمرانیات کی حیثیت سے امتیاز حاصل کیا ہے۔ پروفیسر اور معلم کی حیثیت سے تعلیم عامہ کی تنظیم کی ہے۔ مقرر کی حیثیت سے خطابت کے دریا بہائے ہیں اور اپنی قوم کو غفلت اور پستی سے نکال کر شجاعانہ

کارناموں پر ابھارا ہے۔ انھوں نے تن تنہا خبر رسانی کی ایجنسی اور تحقیقاتی کمیٹی کی خدمت انجام دی ہے اور قومی وردی پہن کر قوم پروروں کے کیمپ میں توپوں کی گرج اور دھوئیں کے بادلوں کے درمیان کام کیا ہے انھوں نے رسوم و روایات کے خلاف جنھوں نے زندگی کو زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، بغاوت کی ہے، اخوت انصاف اور حق کی خاطر بے دھڑک مخالفت کی ہے اور ہر دم اپنی قوم کی محبت اور خدمت میں مصروف رہتی ہیں۔"

ایک اور قوم کے خادم کے لیے جن صفات کی ضرورت ہے وہ خلوص، بے غرضی، ایثار، استقلال اور جفاکشی ہیں اور یہ سب صفات خالدہ خانم میں موجود ہیں۔ مگر ان کے علاوہ ایک ایسی صفت بھی ہے جو ان سب سے زیادہ اہم اور کمیاب ہے یعنی بے نفسی جب آدمی یہ دیکھے کہ لوگ اس کی رائے کو نہیں سنتے اور اس سے مخالف کی رائے کو پسند کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ یہ بھی محسوس کرے کہ اکثریت کی رائے سے مخالفت کرنے سے ملک میں فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اور قوم کے کمزور ہونے کا خطرہ تو بے نفسی کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ خاموش ہو کر بیٹھ رہے اور اس وقت کا انتظار کرے جب لوگ اس کی بات سننے کے لئے تیار ہوں گے۔ اپنی تمام زندگی قوم کی خدمت میں بسر کرنے اور اس کے لئے ہر قسم کی تکلیفیں اٹھا لینے کے بعد اس سے الگ ہو کر خاموش بیٹھ جانا اور شہرت حاصل کرنے کے بعد گمنامی کی زندگی بسر کرنا اتنی بڑی قربانی ہے جو شاید لاکھوں میں سے ایک شخص بھی کر سکتا ہو۔ خالدہ خانم کو یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ مصطفیٰ کمال پاشا ترکی کے ڈکٹیٹر بن گئے اور جمہوریت جس کے لیے یہ سب

کوششیں کی گئی تھیں، اب بھی نصیب نہ ہوئی۔ مگر انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ملک کی
رائے اس وقت مصطفٰی کمال کے ساتھ ہے۔ اگر وہ چاہتیں تو اپنی پارٹی الگ
بنا سکتی تھیں اور ممکن تھا کہ کچھ عرصہ کے بعد ملک کی رائے ان کے ساتھ ہو جاتی
مگر ایسا کرنے سے آپس میں پھوٹ پڑنے اور خانہ جنگی بپا ہونے کا اندیشہ تھا اور
وہ جانتی تھیں کہ ایک قوم کی ترقی میں یہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے عین اس
وقت جب قوم کو ان کی خدمات کا اعتراف کرنا اور ان کی قربانیوں کا صلہ دینا
چاہئے تھا، انھوں نے اپنی قوم اور ملک کی بھلائی کی خاطر اپنے اور ہم خیالوں
کے ساتھ اپنے وطنِ عزیز کو چھوڑنا گوارا کیا اور خاموشی سے اپنے شوہر اور بچوں
کے ساتھ یورپ میں زندگی گزارنے لگیں۔ خالدہ خانم کی شہرت نہ صرف ترکی میں
بلکہ یورپ، امریکہ اور ایشیا تک پھیلی ہوئی ہے اور ان کا نام ہر جگہ عزت اور
احترام سے لیا جاتا ہے ترکی کی تاریخ میں خالدہ خانم کا نام سنہری حروف
سے لکھا جائے گا۔ مصطفٰی کمال پاشا کے انتقال کے بعد پھر ان کے ملک نے
ان کی ضرورت محسوس کی اور انھیں واپس ان کے وطن میں بلا لیا گیا۔ اور اب
وہ پھر دل و جان سے اپنے وطن کی خدمت میں مشغول ہیں۔

عورتیں اور آزادی

جمہوری ملکوں میں

آئیے سب سے پہلے ہم جمہوریت یا پرجاراج کا مطلب سمجھ لیں جمہوریت کے معنی ہیں حکومت کا ایسا ڈھنگ جس میں ملک کی باگ ڈور ایک آدمی یا چند آدمیوں کے ہاتھ میں نہ ہو بلکہ سب لوگ مل کر اپنے اوپر آپ حکومت کریں۔ مثال کے طور پر آپ ہندوستان کے گاؤں کو لے لیجئے۔ اگلے وقتوں میں یہاں پنچایتیں ہوتی تھیں۔ تمام گاؤں والے ایک جگہ اکٹھے ہو کر گاؤں کے معاملوں پر غور کرتے تھے اور جھگڑے قصے نبٹاتے تھے۔ یہ بھی جمہوریت کی ایک سیدھی سادی شکل تھی اسی طرح پرانے زمانے میں یونان کی چھوٹی چھوٹی جمہوری ریاستیں تھیں شہر کے سب رہنے والے ایک جگہ جمع ہو کر اپنے اپنے حلقے کے معاملوں پر غور کرتے، قانون بناتے اور لوگوں کو سزائیں دیتے تھے۔ جمہوریت کا خیال یورپ والوں نے یونان کی اس پرانی ریاست ہی سے لیا۔ لیکن اس کی صورت بہت کچھ بدل گئی۔ گاؤں کی پنچایتوں یا یونان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تو یہ ہو سکتا تھا کہ گاؤں بھر یا شہر بھر کے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر حکومت کے قانون بنائیں لیکن کسی بڑی ریاست یا ملک میں یہ ان ہونی بات ہے کہ سارے ملک کے لوگ ایک جگہ اکھٹے ہو سکیں۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے جمہوریت یا پرجاراج کی پہلی شکل کو

تھوڑا سا بدل کر عام لوگوں کو ووٹ یعنی رائے دینے کا حق دے دیا کہ انھیں جس آدمی پر بھروسا ہو اُسے اپنی طرف سے حکومت کرنے کے لئے بھیجیں۔ چنانچہ جن ملکوں میں جمہوری حکومت ہے وہاں عام لوگ اپنے اپنے نمائندے یعنی اپنی طرف سے رائے دینے والوں کو چن کر چند سال کے لئے پارلیمنٹ میں بھیجتے ہیں اور یہ نمائندے ان کے نام سے حکومت کرتے ہیں۔ اگر کسی نمائندے پر لوگوں کو بھروسا نہ رہے یا یہ دیکھیں کہ وہ ان کی بھلائی کے لئے کام نہیں کر رہا ہے تو وہ دوسری بار اس کو نہیں چُنتے۔

جمہوری حکومت میں دو خاص باتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں امیر غریب، مزدور، سرمایہ دار، مرد عورت سب ایک آنکھ سے دیکھے جاتے ہیں اور قانون کے نزدیک سب برابر ہوتے ہیں۔ دوسرے فرد کو جماعت سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اسے ہر قسم کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ جو چاہے کرے جس قسم کی چاہے زندگی بسر کرے جس مذہب اور جس طریقے کو پسند کرتا ہو اختیار کرے، غرض اس کے نجی معاملوں میں حکومت اس وقت تک کوئی دخل نہیں دیتی جب تک وہ دوسروں کی آزادی میں روڑا نہ اٹکائے جمہوری حکومت میں فرد کی آزادی کی سب سے صحیح تعریف یہ ہے کہ "ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ آزادی ہو بشرطیکہ وہ کسی دوسرے فرد کی آزادی میں حائل نہ ہو"

جیسا کہ میں نے پہلے کہا جمہوری حکومتیں (جن میں انگلستان، امریکہ، چین ترکی، ایران وغیرہ شامل ہیں) ہر فرد کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت برابر سمجھتی اور

ایک نظر سے دیکھتی ہیں۔ ان ملکوں کی عورتوں کو مردوں کی طرح ہر قسم کے سیاسی حقوق اور آزادی حاصل ہے۔ وہ مردوں کی طرح اپنے نمائندے چن کر پارلیمنٹ میں بھیج سکتی ہیں۔ اور عوام کی طرف سے حکومت کر سکتی ہیں۔ انھیں ہر قسم کی تعلیم حاصل کرنے اور ہر قسم کے پیشے اختیار کرنے کی آزادی ہے، وہ جو کام چاہیں کر سکتی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان ملکوں کی ہزاروں عورتیں مردوں کی طرح ہر کام کرتی ہیں۔ وہ دکانوں، ملوں، زراعتی فارموں، کھیتوں وغیرہ میں بھی مردوں کے ساتھ ساتھ سب کام انجام دیتی ہیں۔ انجنیر، اورسیر، وکیل، جج، کلرک، ماسٹر، پروفیسر، مصنف اور اخبار نویس، ڈاکٹر اور نرس بنتی ہیں۔ یہاں تک کہ بری اور بحری (سمندری اور ہوائی) جہاز بھی چلاتی ہیں اور ملک کی حفاظتی فوج میں بھی بھرتی ہوتی ہیں۔ غرض آج کل کوئی ایسا کام نہیں جس میں عورتیں نظر نہ آتی ہوں آج کل کی آزاد عورت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ کوشش کرے تو کسی کام میں بھی ہیٹی نہیں۔

لیکن قدرت نے جہاں مرد اور عورت کو بہت سی باتوں میں ایک سا بنایا ہے وہاں بعض چیزوں میں فرق بھی رکھا ہے۔ عورت میں ماںتا، صبر، خدمت ایثار اور یادداشت کی قوت مرد سے زیادہ اور مرد میں جسمانی طاقت اور جفاکشی کی قوت عورت سے بڑھ کر ہے اس لئے جو عورتیں خالص مردانے پیشے اختیار کر رہی ہیں، وہ اپنے عورت پن یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ اپنی نسوانیت کھو رہی ہیں، اس کے خلاف خود ان کے ملک کے لوگوں میں آواز بلند کی جا رہی ہے اگرچہ جمہوری ملکوں کی بہت سی عورتیں اپنی آزادی سے فائدہ اٹھا کر ہر قسم

کے پیشے جو اِن کی طبیعت سے مناسبت نہیں رکھتے اختیار کر رہی ہیں لیکن وہاں بہت زیادہ عورتیں وہ ہیں جو اپنی فطری صلاحیتوں کو سمجھتی ہیں اور زیادہ تر وہی کام اختیار کرتی ہیں جن کو وہ مردوں سے زیادہ خوبی سے انجام دے سکتی ہیں۔ مثلاً نرسنگ، ڈاکٹری اور مدرسی وغیرہ۔ اب یہ بات عموماً لوگوں نے مان لی ہے کہ بیماروں کی تیمار داری اور بعض علاج، اور بچوں کو تعلیم دینے اور تربیت کرنے کا کام جس خوبی اور خوش اسلوبی سے عورتیں انجام دے سکتی ہیں، مرد اتنی اچھی طرح نہیں کر سکتے۔ اسی لئے جمہوری ملکوں کی عورتیں زیادہ تر اسی قسم کے کام کرتی ہیں۔ ان کاموں کے علاوہ یہ عورتیں ادب کے میدان میں بھی بہت کامیاب ہوئی ہیں۔ ان میں بڑی اچھی اچھی مصنف اور مضمون نگار پیدا ہوئی اور ہو رہی ہیں اور بہت شہرت حاصل کر رہی ہیں۔

ہماری آزاد بہنوں کو اپنے ہم وطن مردوں کی طرح گھریلو زندگی اور سماجی معاملوں میں بھی مردوں کے برابر حقوق اور آزادی حاصل ہے۔ ان میں سب سے اہم مسئلہ شادی کا ہے۔ ان پر کوئی یہ زبردستی نہیں کر سکتا کہ وہ شادی ضرور ہی کریں۔ ان کا جی چاہے عمر بھر کنواری رہیں جی چاہے، خوب بڑی عمر میں بیاہ رچائیں ان پر نہ کوئی بے جا دباؤ ڈال سکتا ہے۔ نہ اعتراض کرتا ہے اور یہ تو ناممکن ہی ہے کہ (ہمارے ہندوستان کی طرح) ان کو سماج یا خاندان کسی ایسے شخص سے شادی کرنے پر مجبور کرے جس سے انھیں نفرت ہو یا جو انھیں ناپسند ہو۔ وہ اس معاملے میں بالکل آزاد ہیں شادی ان کا نجی معاملہ ہے اس بارے میں دوسرے لوگ انھیں مشورہ دے سکتے ہیں، مجبور کرنے کا کسی کو حق نہیں۔

یہ سچ ہے کہ ہماری بدیسی بہنوں کو بہت کچھ آزادی حاصل ہے۔ وہ ذاتی معاملہ میں بھی آزاد ہیں اور سیاسی طور پر بھی ان کو مردوں کے برابر حقوق حاصل ہیں اور وہ ان سب کا پورا پورا فائدہ بھی اٹھاتی ہیں لیکن ان سب سے نتیجہ یہ نہیں نکالنا چاہئے کہ وہ گھریلو زندگی اور ذمہ داریوں کو بھول گئی ہیں اور محض سیر تماشے کھیل کود، راگ رنگ یا باہر کی زندگی اور مردانہ کاموں ہی میں اپنا سارا وقت صرف کرتی ہیں۔ نہیں، ان کے گھر بار، بال بچے بھی ہوتے ہیں۔ ان کو بھی اپنے میاں اور بچوں کے آرام کی خاطر گھر کا کام کاج کرنا پڑتا ہے ان کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی گھریلو زندگی کو آرام دہ اور خوش گوار بنائیں آزادی نے ان کی ذمہ داریوں کو کم نہیں کیا بلکہ اور بڑھا دیا ہے۔ ان پر گھر کے کاموں کے علاوہ باہر کی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ وہ اپنی روزی بھی کماتی ہیں، قوم اور ملک کی خدمت بھی کرتی ہیں اور اپنے گھر بار، بال بچوں کی دیکھ بھال بھی۔ بہت امیر خاندانوں کو چھوڑ کر وہاں عام طور پر گھروں میں نوکر بھی نہیں ہوتے یا ہوئے بھی تو ایک آدھ سے زیادہ نہیں جو صرف چند گھنٹے کام کرنے آتے ہیں وہاں عورتیں اپنے گھر کا تقریباً سب کام خود اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں۔ بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال، کپڑے دھونا، موزے، بنیان، سوئٹر، مفلر وغیرہ بننا، سب خود کرتی ہیں۔ وہاں کپڑے سینے کا رواج کم ہے لیکن دوسری قسم کی دستکاریوں میں بعض جگہ کی عورتیں بہت ماہر ہیں۔ جیسے چین کی عورتیں جن کے ہاتھ کا لاجواب کام ہم یہاں بھی اکثر دیکھتے اور خریدتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھانا پکانے کا کام ہندوستانی عورتوں کی طرح وہاں بھی زیادہ تر گھر والیاں ہی

کرتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے کھانوں میں وہ تکلفات وہ مسالے اور بھوننا اور بھگنا نہیں ہوتا جو ہمارے ہاں ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو وقت کے کھانے اور دو وقت کے ناشتے کی تیاری میں ان کو دو گھنٹے لگتے ہوں گے کیونکہ ایک تو ان کی غذا ہلکی اور سادی ہوتی ہے۔ روٹی جو ہمارے ہاں سب سے جھگڑے کی چیز ہے ہفتے بھر کے لیے ایک دن تنور میں پکالی جاتی ہے یا بازار سے خرید لی جاتی ہے۔ دوسرے سائنس کی نئی ایجادوں نے یہ کام بہت آسان کر دیا ہے وہ سارا وقت ہنڈیا روٹی ہی میں نہیں گنوا دیتیں بلکہ دو تین گھنٹے اس میں صرف کر کے باقی وقت دوسرے کاموں کے لیے بچا لیتی ہیں۔

ان کا ایک بہت ضروری اور اہم کام گھر اور فرنیچر وغیرہ کی صفائی ہے یہ وہ چیز ہے جس کی طرف ہمارے ملک کی عورتیں بہت کم توجہ دیتی ہیں مگر ہماری بدیسی بہنیں اس کام میں اپنا کافی وقت بہت شوق سے صرف کرتی ہیں اور ہر ہر چیز کی صفائی اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں اور باوجود اتنے بہت سے گھر کے کاموں کے ان کے صرف چند گھنٹے ان گھریلو کاموں میں صرف ہوتے ہیں اور وہ کسی جگہ نوکری یا کوئی دوسرا کام کر کے معاش بھی پیدا کرتی ہیں۔ سیر، تفریح، ملنے جلنے کے لیے بھی وقت نکال لیتی ہیں اور آرام بھی خاطر خواہ کرتی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ انھیں ہر قسم کی آزادی حاصل ہے اور وہ اپنے سلیقے سے اپنے وقت کی تقسیم کر سکتی ہیں۔

جمہوری ملکوں کی عورتوں کو جو سیاسی حقوق حاصل ہیں وہ تو ہم ہندوستانی عورتوں کو بھی مل چکے ہیں مثلاً ووٹ کا حق، اکثر جمہوری ملکوں میں بہت لڑنے جھگڑنے اور شور مچانے کے بعد ابھی چند سال ہوئے ملا ہے۔ یہ حق ہندوستانی عورت کو بغیر کسی خاص دقت کے مل گیا۔ یوں بھی ہندوستانی عورت کو ہر قسم کے کام کرنے کی آزادی ہے اور معاشرتی زندگی میں بھی وہ چاہے کرے قانون اس کا ہاتھ نہیں پکڑتا۔ ہندوستانی عورت کی آزادی حکومت نے نہیں مردوں نے اور سماج نے چھین رکھی ہے ہندوستانی عورت سماج کی بندشوں میں اس سختی سے جکڑی ہوئی ہے کہ ہل نہیں سکتی اور سچ تو یہ ہے کہ وہ ہلنے کی کوشش بھی نہیں کرتی۔ اس کی غلامی کی بڑی وجہ اس کی جہالت ہے۔ سماج نے اس کے لیے تعلیم کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ علم کی روشنی سے محروم ہونے کی وجہ سے نہ وہ اپنے حقوق سمجھ سکتی ہے، اور نہ جو حقوق اسے حاصل ہیں ان سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ اگرچہ اب بعض عورتیں تعلیم پانے لگی ہیں لیکن لاکھوں میں سے سو پچاس پڑھ بھی گئیں تو وہ بھلا کس گنتی میں ہیں۔ پھر تعلیم یافتہ طبقے میں سے بعض کو چھوڑ کر جنھوں نے واقعی صحیح تعلیم پائی اور اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھایا ہے اور دوسروں کو فائدہ پہنچایا ہے، زیادہ تر ایسی ہیں جو تعلیم تو پا لیتی ہیں، حقوق اور آزادی کے الفاظ بھی ان کے دماغ میں گونجنے لگتے ہیں لیکن وہ اس کے غلط معنی سمجھتی اور ان کا غلط استعمال کرتی ہیں اور یورپ کی اندھی تقلید کا شکار ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی آزاد مدیسی بہنوں کی محض ظاہری

آزادی کی رٹ کرنا چاہتی ہیں لیکن ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتی ہیں، وہ آزادی کا مفہوم سمجھتی ہیں کہ سماج کی کل بندشوں کو توڑ کر گھریلو زندگی سے آزاد ہو کر اپنی ذمہ داریوں کو چھوڑ اور بھول کر محض فیشن پرستی اور لہو لعب میں ذلت گزارنے کا نام زندگی ہے۔ غرض یورپ کی سب سے گھٹیا قسم کی عورت کی نقل کرنے ہی کو وہ آزادی سمجھتی ہیں جن ہندوستانی عورتوں نے اس قسم کی زندگی کو آزادی کی زندگی سمجھا اور ایسی زندگی اختیار کی ہے انھیں دیکھ کر سماج اور بھی بھڑک جاتی ہے اور عورت کی آزادی کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتی ہے۔ یاد رکھیے ہمیں آزادی تو ضرور حاصل کرنی ہے مگر دوسرے ملکوں کی نقالی نہیں کرنی ان سے اگر کچھ سیکھنا ہے تو ان کی خوبیوں اور ذمہ داریوں کا سیکھنا ہے ان کی اوپری اور باہری زندگی اور ان کی کمزوریوں اور برائیوں کو اختیار کرنا نہیں۔ آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ آزاد انسان اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو جاتا ہے، نہیں آزادی کے بعد تو ذمہ داریاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ ہمیں آزادی اپنے فرائض سے نہیں حاصل کرنی ہے بلکہ ان کو اور بڑھانا ہے۔ ہمیں اپنے گھریلو فرائض، اپنے بچوں، میاں اور دوسرے عزیزوں کی خدمت اور کاموں کے ساتھ ساتھ روپیہ پیدا کر کے اپنے مردوں کے کندھوں سے خرچ کے بوجھ کو بھی کم کرنا ہے، اپنے ملک اور اپنی قوم کی خدمت بھی کرنی ہے۔ ہاں ہمیں پہلے سے سوچ سمجھ کر غور و فکر کے بعد اس میدان میں قدم بڑھانا چاہیے۔ دوسرے جمہوری

ملکوں کی آزاد عورتوں کی طرح ہر پیشے اور ہر کام کو یہ سمجھنا کہ یہ ہمارے لیے مناسب اور موزوں ہیں غلط ہے۔ لیکن وہ کام جن میں عورت مردوں کے برابر بلکہ ان سے زیادہ کامیاب ہو سکتی ہے۔ ہمیں بھی اپنی آزاد بہنوں کی طرح ضرور اختیار کرنے چاہئیں۔ ہر قسم کی دستکاریوں کے علاوہ مدرسی، ڈاکٹری، نرسنگ، ادب کی خدمت اور اس قسم کے دوسرے کاموں کو پہلے سے سوچ سمجھ کر اختیار کرنا چاہیئے۔ اگر ہم آزادی کا صحیح مفہوم سمجھیں اور غور و فکر کے بعد اس کو حاصل کرنے کی دل سے جان توڑ کر کوشش کریں تو ہمارے مردوں اور ہماری سماج کو بھی دوسرے ملکوں کی عورتوں کی طرح ہمیں آزادی دینی پڑے گی اور تب ہم بھی اپنی آزاد بہنوں کے دوش بدوش کچھ کر کے دکھا سکیں گے